یادِ عزیز

اس میں سید الحق عرف محمد عاشق دیسنوی مرحوم کی المناک موت

پر

آنسو بہا کر اُن کی یادوں کا چراغ جلایا گیا ہے

(از)

سیّد صباح الدّین عبدُالرحمٰن

حسب فرمائش

ڈاکٹر سیّد محمد شمیم ام۔بی۔بی۔ایس۔ڈی۔ٹی۔ام اینڈ ایچ

قیمت :- ۵۰/-

Scanned by CamScanner

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی

ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اہل دل سنتے ہیں اک ساز محبت کی نوا
ہم تری یاد میں جب نغمہ سرا ہوتے ہیں

ریاست بہار کی راجدھانی پٹنہ کے پورب طرف اس ضلع سے ۴۲ بیالیس میل دور ایک گاؤں دیسنہ ہے، جو ایک عرصہ دراز تک بڑا آباد، شاداب اور مردم خیز تھا، یہاں ممتاز یونانی طبیب، ام، بی، بی، اس ڈاکٹر، انجینیر، وکیل، اچھے اچھے سرکاری عہدیدار، مصنف، شاعر اور خدا جانے کتنے بی اے اور ام اے پیدا ہوئے، مصنفوں میں ممتاز ترین اسم گرامی جناب علامہ سید سلیمان ندوی (مصنف سیرۃ النبیؐ، سیرۃ عائشہؓ، خیام، عرب و ہند کے تعلقات، خطبات مدراس اور حیات شبلی وغیرہ) کا ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کی گورنری کے زمانے میں وہاں تشریف لے گئے تھے، اسکے کتب خانہ میں راقم نے جب اس گاؤں والوں کی تمام تصانیف ایک ساتھ دکھائیں تو فرمایا کہ جس گاؤں میں اتنے مصنف ہوئے ہوں اس پر ہندوستان کو فخر کرنا چاہیئے،

۱۹۴۷ء کے بعد فلک نے اس کو لوٹ کر ویران کر دیا، یہ راقم اور سعید الحق عرف محمد عاشق دیسی اجڑے دیار کے رہنے والے ہیں، سعید الحق کو برابر عاشق ہی کہا کرتا تھا، آہ! اب ان کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے قلم تھرتھراتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے، میرا خاندان گاؤں کے سادات میں سے تھا، اور عاشق مرحوم کے آباد

اجداد و ملک تھے، مگر یہاں کے سید و ملک آپس میں قریبی رشتہ داروں کی طرح گھلے ملے رہتے تھے، چنانچہ ہم دونوں بھی بھائی بھائی بن کر رہے،

عاشق مرحوم کے خاندان میں تعلیم کئی پشت سے چلی آ رہی تھی، مگر انگریزی کے بجائے فارسی، عربی اور اردو کی تھی، ان کے والد جناب رشید الحق صاحب مرحوم اور منجھلے چچا جناب عبد العظیم صاحب نے پرانے طرز پر فارسی اور اردو کی تعلیم پائی، دونوں درس و تدریس کی ملازمت کرتے رہے، جناب رشید الحق صاحب مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی کے ہم مکتب تھے، اس لئے دونوں میں بڑا ربط رہا، عاشق مرحوم کے بڑے چچا جناب بشیر الحق بیدل صاحب نے انگریزی تعلیم حاصل کی، اور غالباً سنہ ۱۸۹۹ء میں میٹرک پاس ہوئے جس کے بعد وہ پولیس میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے، تقریباً ستاسی برس کی عمر میں جون سنہ ۱۹۶۵ء میں وفات پائی، وہ دیسنہ کے بوڈلین اور خدا بخش تھے، ان کی کمائی کا بڑا حصہ کتابوں کی خریداری میں صرف ہوا، سوتے جاگتے چلتے پھرتے کتابوں کو ساتھ رکھتے، ان کے بستر پر دائیں بائیں سرہانے اور پائینتی میں کتابیں ہی پڑی رہتیں، جس نئی کتاب کا اشتہار کہیں دیکھ لیتے ضرور منگواتے، ان کی محبوب سیر گاہیں یا تو کتب خانے یا کتابوں کی دوکانیں ہوتیں، اسی لئے وہ کتابوں کے ایک انسائیکلوپیڈیا بن گئے تھے، جس موضوع پر کسی کتاب یا مصنف کا نام کوئی پوچھتا، وہ اس طرح بتا دیتے جیسے کوئی اس کا سرورق دیکھ کر بتا رہا ہو، طباعت کا سنہ، مطبع اور کاتب کے نام بھی یاد رکھتے، دیسنہ کے کتب خانہ میں نادر نسخہ

رفتہ رفتہ بیس ہزار کتابیں جمع ہو گئی تھیں، ان میں غالباً زیادہ تر انہی کی دی ہوئی تھیں، جب فلک دیسنہ کو لوٹنے لگا تو جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بہار کی گورنری کے زمانہ میں اس کتب خانہ کو دیسنہ سے پٹنہ خدا بخش خاں کی لائبریری میں منتقل کر دیا، جناب بشیر الحق صاحب کو وطن کی اس متاع عزیز کو وہاں سے منتقل ہو جانے پر بڑا دکھ ہوا، لیکن اس کے بعد وہ زیادہ تر پٹنہ ہی میں رہنے لگے، روزانہ شام کو وہ خدا بخش خاں کے کتب خانہ کے دیسنہ لائبریری کے سیکشن میں اس طرح جا بیٹھتے، جیسے کوئی اپنے گھر میں بیٹھتا ہو، وہیں وہ ایک خلوت در انجمن اور انجمن در خلوت بنائے رہتے،

وہ مضمون نگار اور مصنف بھی تھے، شروع میں ادیب الہ آباد اور خاتون علی گڈھ میں کچھ مضامین لکھے، ان کی زندگی کے آخری دور میں رسالہ آج کل دہلی میں بھی انکے مضامین شائع ہوئے، مئی ۱۹۵۱ء کے معارف میں، ان کا ایک بہت اچھا مضمون سیف الدین باخرزی کی رباعیات پر نکلا، اگست و ستمبر ۱۹۴۹ء کے معارف میں بھی "اصلاحات اقبال" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کو گذشتہ سال مکتبۂ دین و دانش پٹنہ نے رسالہ کی صورت میں شائع کیا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے مجموعۂ کلام بانگ درا کی بعض نظمیں نقش اول میں کچھ اور تھیں، اور نقش ثانی میں کچھ اور ہو گئی ہیں، وہ اقبال کے کچھ ایسے شیدائی رہے کہ ان کے ایسے کلام کی بھی جستجو کی، جو کہیں چھپے تھے، لیکن ڈاکٹر اقبال نے ان کو اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیا، ایسے کلام کو جمع کر کے انھوں نے دو رسالے مرتب کئے، ایک کا

"نام تبرکاتِ اقبال" اور دوسرے کا "مخدوفاتِ اقبال" رکھا، اول الذکر کو ناشر
امیوریم جلبی نے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا، مخدوفاتِ اقبال نہ چھپ سکی، بڑے شفیق
بزرگ تھے، بڑی اچھی موت پائی، رات کو معمولاً خوش خوش سوئے، صبح اٹھے، تو
بے ہوش ہو گئے، چند گھنٹوں کے بعد جاں بحق ہو گئے، اللہ تبارک تعالیٰ ان کو کروٹ
کروٹ جنتِ نعیم عطا کریں، آمین،

عاشق مرحوم کو اپنے چچا سے علمی ذوق کی وراثت ملی، لیکن ان کا اصلی
راس المال ان کی غضب کی ذہانت تھی، جو ان کو اپنی ننھیال کی طرف
سے ملی، ان کے ماموں جناب محمد یونس صاحب وکیل اپنے زمانہ کے بہت ہی ذہین
طالب علم تھے، بی اے بی ایل تک تعلیم پائی، لیکن کبھی کسی امتحان میں فیل نہیں ہوئے
ان کے ہموطن ان کے اس امتیاز کا ذکر برابر کرتے، عاشق مرحوم کو ذہانت ننھیالی
ترکہ میں ضرور ملی، لیکن ان کی غیر معمولی ذہانت خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایک
ایسا عطیہ تھا جو بہت کم لوگوں کو عطا ہوا کرتا ہے،

میں اور وہ دیسنہ کے مکتب میں ایک ساتھ ایک ہی درجہ میں داخل ہوئے،
لیکن ہمدرس ہونے کے باوجود ہم دونوں میں وہی فرق تھا، جو ایک استاد اور
شاگرد میں ہوتا ہے، مکتب کے مولوی صاحب اردو یا فارسی کا جو سبق دیتے، عاشق مرحوم
متانت سے سنتے رہتے، چھٹی ہو جاتی تو وہ مولوی صاحب ہی کی شان سے وہی سبق دیتے
نظر آتے، مکتب کے گروجی کوئی حساب بتاتے تو ہم لوگ ان سے زیادہ عاشق مرحوم

سے سمجھتے، وہ کھیل کے میدان میں ساتھیوں کے ساتھ گیند کھیلتے تو میدان کو بھی درسگاہ بنا دیتے، کبھی اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں گاتے رہتے، کبھی سعدی کا کوئی قطعہ پڑھتے یا کبھی حافظ کی غزل کا نغمہ بلند کرتے رہتے، وہ کبڈی کھیلتے تو اس کے خاص خاص الفاظ کے بجائے کوئی شعر پڑھتے ہوئے اپنی طرف سے مخالف کی جانب دوڑتے اور واپس آتے، گوئیاں کھیلتے تو ان کو ہارنے اور جیتنے کی فکر نہ ہوتی، بلکہ اسی کھیل میں یا تو فارسی کے کسی شعر کا مطلب بیان کرنے میں لگے رہتے یا کسی حساب کے حل کرنے کے طریقہ پر بحث کرتے رہتے، یا کسی شعر یا مصرع یا کسی فقرہ کو دہرا کر اس کی داد طلب کرتے۔

ان کو فطری طور پر بذلہ سنجی اور خوش کلامی کا بھی بڑا ملکہ حاصل تھا، لڑکپن ہی سے لطیفے اور چٹکلے بیان کر کے ہم لوگوں کو محظوظ کیا کرتے تھے، جو وہ کہیں سن یا پڑھ لیتے تو ان کے ذہن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے، مکتب ہی کا زمانہ تھا کہ ایک بار شراب کا ذکر آگیا تو کہنے لگے کہ ایک صحابی کہیں سے گذر رہے تھے، تو دیکھا کہ کچھ کفار شراب پی رہے ہیں، بہت خوش ہیں، کیف و سرور کا ایک عالم آباد ہے، صحابی نے یہ کیفیت دیکھ کر دل میں کہا کہ معلوم نہیں ایسی اچھی چیز اللہ تعالیٰ نے کیوں حرام کر دی، یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گئے، واپس ہوئے تو اسی ساغر و مینا کی مجلس کو درہم برہم دیکھا، دو تین تو آپس میں گتھم گتھا تھے ایک صاحب کہیں دور نشہ میں مست پڑے تھے کہ یکایک ایک کتا آیا، اور اس کے منھ پر ٹانگ اٹھا کر پیشاب کر کے آگے بڑھ گیا، صحابی نے یہ دیکھ کر کہا، یہ شراب اسی لائق ہے کہ حرام کر دی جائے

Scanned by CamScanner

(ناظرین اس روایت کی سند پر غور کرنے کے بجائے اس سے صرف لطف اُٹھائیں)
شراب کے بعد افیون کا ذکر آگیا تو عاشق مرحوم پھر گویا ہوئے کہ موتی ہاری
(ضلع چمپارن بہار) میں دو اچھے خاصے صاحبان افیون کے عادی تھے، اور مدک
بھی پینے لگے تھے، ایک روز دونوں اسی سے شغل کر رہے تھے کہ ایک مینڈک
اچھلتا کودتا وہاں پہنچ گیا، ان میں ایک صاحب نے مدک کا دھواں منھ سے اس پر
چھوڑا تو وہ بے کیف نہیں ہوا، بلکہ بظاہر اس پر بھی سرور طاری ہوگیا، وہ بیٹھا
رہا، دونوں اس پر دھواں چھوڑتے رہے، جب یہ دونوں اٹھ گئے تو مینڈک بھی
چلا گیا، دوسرے دن یہ دونوں پھر اپنے شغل میں مشغول ہوئے، تو وہ مینڈک
بھی وہاں پہونچ گیا، اور ان کے دھوئیں سے لطف اندوز ہوتا رہا، مینڈک کا
یہ معمول ہوگیا کہ وہ وقت پر پابندی کے ساتھ ان کے پاس پہونچ جاتا اور یہ تینوں
ہم جلیس ہوجاتے، دسہرہ پوجا کی چھٹیوں میں دونوں صاحبان اپنے اپنے وطن گئے،
وہاں سے واپس آئے، تو دیکھا کہ مینڈک اپنی خاص جگہ پر منھ پھیلائے پاؤں پسارے
چت ہوکر نیم جان پڑا ہوا ہے، دونوں صاحبان کو خیال ہوا کہ
مر رہا ہے، لیکن ایک صاحب نے کہا، بھائی جان! ذرا مدک کا
دھواں تو اس پر دیجئے، دونوں باری باری اس پر دھواں دینے
لگے تو اس میں پہلے حرکت پیدا ہوئی، پھر مزید دھوئیں سے اٹھ بیٹھا
اور شریک مجلس ہوگیا،

Scanned by CamScanner

ایک بار حقہ کا ذکر آگیا تو کہنے لگے کہ دیسنہ کے ایک بزرگ محترم جناب صدیق حسین صاحب مختار کے یہاں (جو آگے چل کر ان کے خسر بھی ہوئے) ایک نوجوان عزیز .... آکر مہمان ہوئے، انکو طالب علمی ہی میں سگریٹ، بیڑی اور حقہ کی بری عادت پڑگئی تھی، وہ مختار صاحب کے ایک نوکر کے پاس جاکر حقہ پینے لگے، مختار صاحب نے یہ حرکت دیکھی تو ان کو ناگوار ہوا، لیکن اس وقت تو وہ خاموش رہے، دوسرے دن انھوں نے نوجوان عزیز کو اپنے پاس بلایا، ان سے کہا "بیٹا! ذرا میرے جوتے تو پہنو، ان کے اصرار پر نوجوان عزیز نے جوتے پہن لئے، تو یہ پاؤں میں برابر ہوئے، یہ دیکھ کر مختار صاحب نے ان سے کہا "بیٹا اب ہم تم برابر ہوگئے، تو پھر یہ حقہ ہے، لو میرے سامنے پیو، نوکر کے پاس اب جانے کی ضرورت نہیں" یہ سُن کر نوجوان عزیز بے حد شرمندہ ہوئے،

عاشق مرحوم اپنے بچپن میں ہر قسم کی سوسائٹی میں بیٹھ کر اس سے لطف لیتے، گاؤں میں ایک بوڑھی خاتون تشریف بوا تھیں جو گاؤں کی پرانی باتیں سنا کر یادوں کے چراغ روشن کیا کرتی تھیں، عاشق مرحوم ان کے پاس جاکر بیٹھتے اور ان سے جو کچھ سنتے، اسی دلچسپ انداز میں بیان کرتے، گاؤں میں ڈاکٹر احمد کریم بہت ہی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، ان کے مکان کی رکھوالی ایک پٹھان گوہر خاں کیا کرتے تھے، ان کو گیر کے دوہے بہت یاد تھے، وہ تاڑی بھی پیتے، جس کو وہ آسمانی پانی کہا کرتے، اور اس پر بہت سے اشعار سنایا کرتے تھے، عاشق مرحوم

Scanned by CamScanner

کو ان کی تمام باتیں حافظہ میں محفوظ ہو جاتیں جو ہم لوگوں کو بھی موقع بموقع سناتے تھے، گاؤں کی ایک بڑی بوڑھی دائی انجریا تھی جو شادی بیاہ کے موقع پر فحش گیتوں سے سب کی تواضع کیا کرتی تھی، بوڑھے، جوان اور نوجوان کسی کو نہ بخشتی، عاشق مرحوم کے حافظے کے حاشیے میں اس کے گیت بھی محفوظ ہوتے اور سنا کر ہم لوگوں کو گدگدایا کرتے تھے، گاؤں کے سینچر چمار، اس کی ضخیم و دبیز بیوی، املک دھاری و بو ساد جیتی پاسبان، گل چرن دھوبی، سوداگر اور اجودھا کہار، بچو سنار اور ٹہل ساد تیلی سے بھی ان کی باتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان کے دیہاتی چٹکلوں سے ہم لوگوں کو بھی محظوظ کیا کرتے تھے،

مکتب سے نکل کر ہم دونوں انگریزی تعلیم کے لئے پٹنہ پہونچے یہ سنہ ۱۹۲۰ء کا سال تھا، اس وقت ترک موالات کی تحریک اور خلافت کا ہنگامہ جاری تھا مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی لوگوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، ان ہی کی تحریک پر سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بھی مقاطعہ جاری تھا، میں گلزار باغ پٹنہ کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہو گیا، جو ایک نیم سرکاری اسکول تھا، عاشق مرحوم پٹنہ میں اپنی نانی کے سگے بھائی حکیم عبدالحئی کے یہاں رہنے لگے تھے، جو ترک موالات کے حامی تھے، اس لئے انھوں نے ان کو ایک نیشنل اسکول میں داخل کر دیا اس میں پڑھائی کم ہوتی، طلبہ کو جلسے اور جلوس میں زیادہ استعمال کیا جاتا، مجھ کو

Scanned by CamScanner

اپنے ایک بزرگ کے ساتھ ایک روز پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا، تو عاشق مرحوم کو کانگریس کا جھنڈا لئے ہوئے ایک جلوس کے آگے دیکھا، وہ سب کے ساتھ ترانے بھی گا رہے تھے، اور نعرے بھی بلند کرتے جاتے تھے، مجھ سے ملے تو ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو کرنے لگے، اسی زمانہ میں بنارس سے بابا خلیل داس پٹنہ آگئے تھے، وہ اپنے قومی کاموں کے لئے بہت مشہور تھے، بنارس میں تعلیم پائی تھی، ایم اے تھے، سنسکرت کی لیاقت بہت اچھی تھی، اس لئے نام کے ساتھ داس لکھنے لگے تھے، خدمت کے جذبے میں بہت سے سقے ساتھ رکھتے، جہاں جاتے انہی سقوں کی مدد سے صفائی اور دوسرے کاموں میں لگ جاتے، ہندو مسلمان کے اتحاد پر تقریریں بھی جابجا کرتے پھرتے، عاشق مرحوم نے بتایا کہ انھوں نے ایک تقریر میں کہا کہ ہم لوگ روزانہ ہر وقت "ہم" کا لفظ بولا کرتے ہیں، جس سے مراد ہندو اور مسلمان ہیں، ہندوستان میں ہندو پہلے سے تھے بعد میں مسلمان آئے اس لئے "ہم میں" "ہ" پہلے اور "م" بعد میں ہے، لیکن جس طرح ہم ملا ہوا ہے اسی طرح ہندو اور مسلمان کو ہندوستان میں مل کر رہنا چاہئے،

عاشق مرحوم کے والد نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کے لئے ریفنٹل اسکول موزوں جگہ نہیں، اس لئے ان کو ان کے ماموں جناب محمد یونس صاحب وکیل کے پاس بتیا ضلع چمپارن بھیج دیا، اس طرح ان کا ایک سال ضائع ہو گیا، اور میں اسکول میں ایک درجہ ان سے آگے ہو گیا، لیکن ان کا علم مجھ سے بہت آگے

Class No. 107/063
Book No. 1698

رہا، ہم دونوں میں وہی فرق تھا جو دیو اور بونے میں ہوا کرتا ہے، وہ میٹرک سے
چار درجے نیچے ہی تھے کہ وہ ایسی ایسی باتیں بتاتے جن سے میٹرک کے درجہ کے لڑکوں
کو بھی کم واقفیت ہوتی، ہم دونوں اپنے وطن چھٹیوں میں آتے تو وہ زیادہ تر
نصاب ہی کی گفتگو کرتے رہتے، پوچھتے کہ into اور in، at اور in، on اور
upon اور shall، will اور Should، Would کا فرق جانتے
ہو؟ Cognate object کی تعریف کر سکتے ہو؟ میں خاموش رہتا
لیکن اس سلسلہ میں ان کی بتائی ہوئی باتیں اب تک ذہن میں منقوش ہیں، وہ
انگریزی نظموں میں سے کبھی Lucy Goey کبھی We ar seven
اور کبھی Afler Blhenhem کو انگریزوں ہی کے لب ولہجہ میں زبانی
سنانے لگتے، کبھی کہتے کہ چلو تمکو بتائیں کہ دنیا کے گول ہونے کے کیا کیا ثبوت ہیں
اور ابھی اس کو ختم بھی نہیں کر پاتے کہ ان کی گفتگو اس پر چل نکلتی کہ انگلستان
کے بادشاہ جون سے وہاں کے لوگوں نے میگنا کارٹا کیسے حاصل کیا، اور پھر اس کی
اہمیت کی وضاحت کرتے، کبھی زمین ہی پر اقلیدس کے کسی تھیورم یا پرابلم کی
لکیریں کھینچ کر اسکو سمجھانے لگتے، پھر اسی سانس میں انگریزی الفاظ کے صحیح تلفظ
انگریزوں کے لب ولہجہ میں بتانا شروع کر دیتے، ایک روز پوچھنے لگے کہ بتاؤ انگریزی
میں سب سے بڑا لفظ کون سا ہے، میں نے لاعلمی ظاہر کی تو بتایا Nchilipuli
fication ـ یہ لفظ ان ہی کا بنایا ہوا اب تک یاد ہے، ہم دونوں کے

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
دار المصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڈھ۔ یوپی
AZAMGARH

اور دوسرے ساتھی ان کی علمی گفتگو کی تاب زیادہ دیر تک نہیں لاتے، اور وہ مجھ کو اسی لئے پسند کرتے کہ وہ میری نگاہوں کو دیکھ کر سمجھتے رہتے کہ میں ان کی گفتگووں کی قدر کرتا ہوں، بلکہ ان کو محفوظ رکھتا ہوں، گویا میں ان کے علم و ادب کے خمیر کا رکھوالا بنتا جا رہا تھا،

وہ میٹرک سے ایک درجہ ابھی نیچے ہی تھے کہ ان کی زبان پر ٹینی سن، گولڈ اسمتھ میکاولے شیکسپیر، اور ملٹن کا ذکر برابر رہنے لگا، ٹینی سن کی مشہور نظم Enoch Arden کی کہانی پہلی دفعہ ان ہی کی زبانی سنی کہ کس طرح ایک بحری سمندر کے سفر پر گیا، اس کے ڈوب جانے کی غلط خبر اس کی بیوی کو ملی، تو اس نے دوسری شادی کر لی، بحری گھر لوٹا تو اس کو اپنی بیوی کی دوسری شادی کی خبر ملی، پھر بھی وہ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لیے بیتاب رہا، آخر اس نے اپنی بیوی کو چپ چاپ دوسرے شوہر کے ساتھ اس طرح دیکھا کہ اس کی بیوی کو خبر نہ ہوئی، پھر دیکھ کر لاپتہ ہو گیا، اس پوری کہانی کو عاشق مرحوم نے بہت موثر انداز میں سنایا تھا، اسی زمانہ میں ان کو گولڈ اسمتھ کے مشہور مضمون Fame Coach کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا، ان ہی کی زبانی مجھکو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ گولڈ اسمتھ لکھتا تو بہت اچھا تھا لیکن کسی سے ٹھکانے کی گفتگو مطلق نہ کر پاتا تھا، اسی لئے اس کے بارہ میں اس کے کسی معاصر نے کہا تھا،

He writes like an angel but speaks like poor poll

Scanned by CamScanner

عاشق مرحوم نے یہ بھی بتایا کہ جانسن اس کے متعلق کہا کرتا تھا،

He should not like to hear himself.

اسی لئے لوگ اس کو Inspired idiot کہا کرتے تھے،

ان کو میکاولے کے Essays سے بڑی دلچسپی ہو گئی تھی اور اس کے بڑے بڑے الفاظ ان کی زبان پر ہوتے اس کمسنی میں ان کا معمول تھا کہ جب کوئی کتاب یا مضمون پڑھتے تو اس کے نئے الفاظ اچھے اچھے فقرے بلکہ عمدہ پیراگراف اپنی ایک کاپی پر لکھ لیتے، اور ان کو روزانہ الٹ پلٹ کر دیکھا کرتے، ان کا حافظہ بہت ہی قوی تھا، اس لئے جو کچھ پڑھتے ان کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا، قوت گویائی بھی پوری پائی تھی، اس لئے موقع بموقع ان کو دہرایا کرتے تھے، میکاولے نے ہندوستانیوں اور خصوصاً بنگالیوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کو پڑھ کر ہر ہندوستانی کی دل آزاری ہوتی ہے، لیکن میکاولے کے زبردست اہلِ قلم ہونے میں کسی کو شک نہیں، عاشق مرحوم نے ایک روز بتایا کہ میکاولے کی تنقیدی تحریروں میں عصبیت اور جارحیت ضرور ہوتی ہے، لیکن وہ اپنی اسی قسم کی تحریروں سے اپنے حریفوں اور مخالفوں کو زیر بلکہ دم بخود کر دیا کرتا، وہ جو کچھ لکھتا، پورے اعتماد کے ساتھ لکھتا، اسی لئے اس کے ایک مداح لارڈ ملبورن نے کہا تھا کہ کاش مجھ کو کسی ایک بات پر اسی طرح یقین کامل ہوتا جس طرح کہ میکاولے کو اپنی ہر بات پر رہا کرتا ہے، عاشق مرحوم نے یہ بھی بتایا کہ میکاولے کی تحریروں میں ملٹن کے

معری اشعار کی طرح زیادہ تر مختلف زمانے کی بربادی کا ذکر ملتا ہے،

اسی زمانہ میں انھوں نے شیکسپیر کے کئی ڈرامے پڑھ لیے تھے، کبھی ہیملیٹ کبھی لیر، کبھی

رومیو، اور کبھی شائلاک کی گفتگوئیں دہرا کر ہملوگوں کو محظوظ کرتے اور ایکٹ کرتے

ہوئے کبھی انٹونیو، کبھی پورشیا اور کبھی جولیٹ بن جاتے، آخر آخر وقت تک

ان کو شیکسپیر سے بڑی دلچسپی رہی،

ان کے اسکول کے ہیڈ مولوی صاحب شاعر تھے، ان کی شاعری ان کو

ایسی پسند آگئی کہ ان کی ساری نظمیں اور غزلیں ایک کاپی پر نقل کر لی تھیں، جو

ہملوگوں کو سنایا کرتے اور ہر شعر اور ہر مصرع کی داد خود دیتے، میں ان کی گفتگوئیں

سُن کر تھک جاتا تو کہتا کہ تمھارا حافظہ تو عمرو عیار کی زنبیل ہے، کہاں تک ساتھ دے

جائے، ان کی اس اٹھان کو دیکھ کر ان کے ہموطن بزرگ کہتے کہ معلوم نہیں

آگے چل کر یہ لڑکا کیا ہوگا،

وہ خوش گلو بھی تھے، اس زمانہ میں دیسنہ کی انجمن الاصلاح کا سالانہ جلسہ

بہت دھوم دھام سے ہوتا، جلسہ گاہ کی بڑی حسین اور رنگین آرائش کی جاتی

وہ اس جلسہ میں کبھی حافظ کی غزل اور کبھی اقبال کی نظم سناتے، تو لوگ ان کے ترنم

ترنم سے متاثر ہو کر ان کو گلے لگا لیتے، کوئی ان کو نقد روپیے انعام دیتا کوئی فاؤ

ٹین پن یا کوئی اور چیز پیش کرتا،

وہ گاؤں میں جہاں بیٹھ جاتے اپنی گفتگوؤں اور لطیفوں سے مجلس کو

گلزار بنائے رکھتے، ایک روز ہملوگ گاؤں کی مسجد کی بارہ دری میں بیٹھے تھے نماز کا ذکر آگیا، تو نماز سے متعلق اتنے چٹکلے سنائے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے حافظہ میں ان چٹکلوں کا ایک گودام قائم ہے، کہنے لگے، ایک خاتون نماز کی بہت پابند تھیں لیکن ان کے شوہر کا نام رحمت اللہ تھا، اس لئے جب سلام پھیرتیں تو شوہر کے احترام میں کہتیں، السلام علیک یا بابو کے ابا! کیونکہ ان کے کان میں یہ بات بھی پڑی ہوئی تھی کہ شوہر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اسی کے ساتھ یہ روایت بھی بیان کی، کہ بغداد کی ایک خاتون نماز پڑھ رہی تھیں، سجدہ میں گئیں تو چھت پر سے ایک بچھو ان کی پیٹھ پر گرا اور مسلسل ڈنک مارتا رہا، لیکن انھوں نے نماز پوری ادا کی اور کسی بے چینی کا اظہار نہیں کیا، لیکن جب سلام پھیرا تو ڈنک کی تکلیف سے بے ہوش ہوگئیں انکو ہوش آیا تو عزیزوں نے پوچھا کہ جب بچھو ڈنک مار رہا تھا تو نماز چھوڑ کر بچھو کو پیٹھ پر سے کیوں نہیں ہٹایا، جواب دیا اللہ کے دربار میں اس کے سامنے تھی، پھر یہ بے ادبی کیسے کرتی،

پھر کہنے لگے کہ ایک سبزی فروش مغرب کی نماز مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ ضرور ادا کرتا، فرض کے بعد دو رکعت سنت بہت دیر میں ختم کرتا، دوسرے نمازیوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا، کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ دو رکعت سنت میں اتنی دیر کیوں لگاتے ہو، اس نے جواب دیا ارے بھائی، دن بھر کے سودے کا حساب ان ہی دو رکعتوں میں تو کر لیتا ہوں، پھر کہاں فرصت ملتی ہے،

Scanned by CamScanner

اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ رابعہ بصریؒ عشق الٰہی میں مغلوب الحال رہتیں، ہر وقت اور ہر لمحہ ان کی زبان پر کلام الٰہی ہوتا حج کے لیے گئیں، تو عشق الٰہی کے بار سے لدی اور جھکی ہوئی خانہ کعبہ کے پاس پہونچیں تو ان کی چشم بینا نے دیکھا کہ خانہ کعبہ ان کی تعظیم میں جھک گیا ہے، ہر طرف ان کی اس تعظیم کا شور ہوا، کچھ دنوں کے بعد حضرت ابراہیم ادھمؒ حج کے لئے روانہ ہوئے، تو ہر دو قدم پر دو رکعت نماز پڑھتے جاتے، خانہ کعبہ کے پاس پہونچے تو ان کو خیال ہوا کہ خانہ کعبہ ان کے استقبال میں شاید جھکے لیکن ندا آئی کہ رابعہ بصریؒ نیاز کی راہ سے آئی تھیں، تم نماز کی راہ سے آرہے ہو، تم میں اور ان میں بہت فرق ہے،

پھر کہنے لگے کہ ایک بار لکھنؤ میں ایک عام جلسہ ہو رہا تھا جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے علاوہ اور بھی سوٹ بوٹ والے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان وہاں موجود تھے، مغرب کا وقت آیا، تو نماز کے لئے جلسہ ملتوی کر دیا گیا، جماعت کھڑی ہونے کو تھی کہ صاحب قسم کے لوگ کترا کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے، مولانا شوکت علی سب کے پاس فرداً فرداً پہونچے، اور ان سے کہا کہ اگر وضو نہیں بھی ہے تو بے وضو جماعت میں شریک ہو جاؤ، اس وقت بے وضو کی نماز میں جو شان پیدا ہوگی اور غیر مسلموں پر جو رعب پڑیگا، وہ اور وقت کی باوضو نماز میں نہیں پڑ سکتا ہے، ان کے اصرار پر اس شان اور رعب کے لئے صاحب لوگ بے وضو جماعت میں شریک ہو گئے،

Scanned by CamScanner

اس سلسلہ میں کہنے لگے کہ غالب، روزہ نماز کے پابند نہ تھے، ایک بار دہلی میں شام کو اپنے ایک رئیس دوست آزردہ کے ساتھ ان کی فٹن پر سیر کو نکلے، تو راستہ میں جامع مسجد آگئی، آزردہ نے کہا چلو، مغرب کی نماز پڑھ لیں، غالب بھی ان کے ساتھ ہولئے نماز پڑھ کر دونوں مسجد سے باہر نکلے، تو غالب نے آزردہ سے کہا، مجھکو خطرہ تھا کہ تم مجھ سے نماز پڑھواؤ گے، مگر تم بھی کیا یاد کرو گے، میں نے بھی نماز بے وضو پڑھا دی،

اسی سلسلہ میں عاشق مرحوم نے بیان کیا کہ ایک بار ایک مسلمان دھوبی کا ایک گدھا، دہلی کی مسجد میں گھس آیا، مسجد کے امام صاحب اس کو دیکھ کر بہت خفا ہوئے، وہ اپنی خفگی کا اظہار کر رہے تھے کہ دھوبی آگیا، اسکو دیکھ کر امام صاحب اور بھی زیادہ برہم ہوئے، دھوبی نے اُن کی خفگی کو سنکر کہا، امام صاحب کاہے کو خفا ہوتے ہو، یہ نا سمجھ جانور تھا، جو چلا آیا کبھی مجھکو بھی یہاں آتے دیکھا ہے،

رمضان شریف میں گاؤں کی اسی مسجد کی بارہ دری میں ہم لوگ جمع ہو کر افطار کیا کرتے تھے، عاشق مرحوم ترنگ پر آجاتے تو پھر روزے اور افطار ہی پر ان کی گفتگو چل نکلتی، ایک روز کہنے لگے کہ ان کے بزرگ محترم جناب صدیق حسن صاحب مختار (جو آگے چل کر ان کے خسر بھی ہوئے) کے پاس رمضان شریف میں سہ پہر کو ایک شیعہ صاحب ملنے آئے، افطار

کا ذکر آیا تو وہ شیعہ صاحب بولے سنی حضرات آفتاب کے غروب ہونے کا خیال کیے بغیر افطار کر لیتے ہیں، مختار صاحب نے برجستہ جواب دیا نہیں حضرت! ایسی بات تو نہیں، جو آفتاب کو غروب ہوتے نہ دیکھے تو یہ اس کی بصارت کا نقص ہے، شیعہ اور سنی میں بس یہی بصارت اور بصیرت ہی کا تو فرق ہے۔

پھر کہنے لگے کہ رامپور کے نواب حامد علی خاں جب کبھی روزے رکھتے تو عصر کے وقت ہی کہتے کہ میں تو سنیوں کے مسلک کے مطابق آج روزے ابھی افطار کرتا ہوں،

اسی سلسلہ میں گویا ہوئے کہ غالب روزے نہیں رکھا کرتے تھے کسی رمضان شریف کے ختم ہونے پر بہادر شاہ ظفر سے ملنے لال قلعہ گئے تو بہادر شاہ ظفر نے ان سے پوچھا کہ کتنے روزے رکھے، غالب نے برجستہ کہا در جہاں پناہ ایک نہیں رکھا!"

پھر کہنے لگے کہ غالب رمضان شریف میں اپنے گھر کے تہ خانہ میں بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ گنجفہ کھیلتے تھے، ایک روز ان کے ایک مولوی دوست ان سے ملنے آئے، تو ان کو ڈھونڈتے ہوئے تہ خانہ میں پہونچ گئے، گنجفہ کی بازی دیکھ کر مکدر ہوئے، بولے "لاحول ولا، میں تو سمجھا تھا کہ رمضان شریف میں شیطان بند کر دیا جاتا ہے" غالب نے یہ سُن کر برجستہ کہا "حضرت جہاں شیطان بند کیا گیا ہے، وہ جگہ یہی ہے!"

Scanned by CamScanner

وہ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے تو ہم لوگوں کو یقین تھا کہ فرسٹ ڈویزن میں ضرور پاس ہونگے، لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو ہماری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ تھی جب یہ معلوم ہوا کہ پورے صوبے بہار میں ان کی پوزیشن اوّل ہے، یہ سال ۱۹۲۶ کا تھا، ان کی اس کامیابی پر نہ صرف ان کے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں بلکہ بہار کے مسلمانوں کو بھی فخر محسوس ہوا، اور سب کی نظریں ان کی طرف اُٹھ گئیں، لیکن خود ان پر کوئی خاص اثر نہ تھا، جیسے ان کے لئے یہ کوئی غیر متوقع چیز نہیں تھی، انھوں نے بہار نیشنل کالج پٹنہ میں آئی۔ اے میں داخلہ لیا، یونیورسٹی اور کالج کی طرف سے ان کو گراں قدر وظائف ملے، اس لئے ان کو مالی فراغت بھی حاصل ہوگئی، میں میٹرک پاس ہو کر مظفر پور کے گورنمنٹ کالج میں ایک سال پہلے داخل ہوگیا تھا، جو اس وقت گریر بھومی ہار برہمن کالج کہلاتا تھا،

وہ آئی۔ اے کے پہلے سال میں تھے تو انھوں نے پوری بائبل پڑھ ڈالی، اس کی پاکیزہ انگریزی مشہور ہے، اس لئے انھوں نے اس کا مطالعہ شروع کیا، تو اس کے خوبصورت اور موثر جملے ان کی زبان پر رہنے لگے، ان ہی نے مجھے توجہ دلائی کہ اس کا طرز ادا عام انداز بیان سے بالکل علیحدہ ہے، جو Whoso Keepeth, He That Saith

He that loveth جیسے فقروں سے ظاہر ہوتا ہے، انھوں
نے یہ بھی مجھکو بتایا کہ اس کی گرامر بھی مختلف ہے، مثلاً اب ایسے جملے نہیں
لکھے جائیں گے؛ Jesus is come, You are come
Whence come you, We wil be gone,

wherefore ye look so sadly to day,

ان کی نوٹ بک میں بائبل کے بہت سے اچھے اچھے جملے لکھے ہوئے
تھے، جو مجھکو سناتے رہتے، ان میں سے انہی کے بتائے ہوئے کچھ جملے
ابھی تک یاد ہیں؛

1 Faithful are the wounds of a friend but the kisses of an enemy are, deceitful,

2. Open rebuke is better than secret love.

3. wrath is cruel and anger is outrageous, but who is able to stand before envy.

4. God is love, and he that dwelleth in

love dwelleth in God and God in him

5. As the fining pot for a silver and the furnace for gold, so is a man to his praise,

6. If a ruler hearken to lie all his servants are wicked

7. The rod and reproof give wisdom. but a child left to himself bringeth his mother to shame,

اسی زمانہ میں انھوں نے چارلس ڈکنس کے ناول بھی پڑھ ڈالے
تھے، اس کے ناولوں میں Pickwick اور Macawbe
کے جو کیرکٹر ہیں، ان سے متاثر تھے، اور کہتے کہ انگریزی ادب میں ان
کیریکٹروں سے ہمیشہ لطف لیا جائیگا، وہ یہ بھی کہتے کہ چارلس ڈکنس کے
ناولوں میں انگلستان کے غریبوں کی مصوری بہت اچھی ملتی ہے، ان
ہی سے معلوم ہوا کہ چارلس ڈکنس چلتے پھرتے بھی سو سکتا تھا،
یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ڈیسنہ کے کتب خانہ کے لئے ایک اچھی عمارت بن گئی
تھی، اس کے ناظم جناب سید عبد الحکیم صاحب مرحوم کی کوششوں کی بدولت

تمام کتابیں الماریوں میں سجی سجائی نظر آتی تھیں، ہم لوگ گھروں میں
ہوتے تو اس کتب خانے کے ہال میں بیٹھے رہتے تھے، عاشق مرحوم اس
میں میر مجلس ہوتے، وہ کبھی مولانا شبلی، کبھی محمد حسین آزاد، کبھی حالی اور
کبھی ڈپٹی نذیر احمد کی کوئی کتاب الماری سے نکال لیتے، اور اس کا کوئی
حصہ پڑھ کر سناتے اور اس پر تبصرہ کرتے جاتے، مولانا شبلی کی کوئی تحریر
پڑھتے تو کہتے کہ ذرا اس کی لطافت اور متانت تو دیکھو، اسی نابغۂ عصر نے
الفاروق، المامون، سیرۃ النعمان، موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم اور آخر
میں سیرۃ النبیؐ لکھ کر مسلمانوں کے سروں پر ان کی تاریخ، ادب اور مذہب
کی عظمت و جلالت کا نیا تاج رکھ دیا ہے، محمد حسین آزاد کی کوئی کتاب
پڑھ کر سناتے تو کہتے کہ ان کی تحریر کا رسیلاپن اور بانکپن تو دیکھو ان کے
ہر جملہ سے انشا پردازی کا رس ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے، وہ حالی کی سادگی
کے بھی معترف تھے، کہتے کہ ان کی تحریر بظاہر اوبالی کھچڑی اور بے نمک
مرچ کا سالن معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ مدعا نگاری کی اعلیٰ مثال ہے، ہر
اس کے اندر جو اخلاص ہے، اسی کی وجہ سے دوسروں کا بانکپن ان کی
سادہ پن پر قربان ہے، کہتے کہ اگر حالی یادگار غالب نہ لکھ جاتے تو غالب
کو وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو آج ہے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ غالب کی شہرت
کا سکہ دیوان غالب سے یا یادگار غالب کی بدولت چل نکلا عاشق مرحوم ہی

نے پہلی دفعہ مجھکو ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں میں یہ پڑھ کر سنایا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے سلسلہ میں آپ کے لیے [illegible] بھاگ گئے، چھاتی پر مونگ دلتے رہے، جیسے مکروہ الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ہم لوگوں کو بتاتے کہ ان کی تحریروں میں جو برجستگی ہے جو بے ساختگی ہے، جو زور بیان ہے اور جو خطیبانہ شان ہے، وہ کسی اور میں نہیں، ان کو مولانا شبلی کی شعرالعجم بہت پسند تھی، وہ میٹرک کے امتحان میں پورے صوبے میں اول آئے تو دیسنہ کی انجمن الاصلاح کی طرف سے انکو سونے کا ایک تمغہ پیش کرنے کی تجویز منظور ہوئی، لیکن انھوں نے سونے کا تمغہ لینے کے بجائے شعرالعجم کی پانچوں جلدیں لینے کی خواہش ظاہر کی، اور یہی ان کو دی گئیں، جن کا مطالعہ وہ برابر کرتے رہے، ان کو مولانا محمد علی کی انگریزی بھی بہت پسند تھی، اسی لیے کامریڈ کے پرانے پرچے برابر پڑھا کرتے تھے اس میں سے ان کو ولایت علی بمبوق مرحوم کے مضمون بٹوارہ کا بڑا حصہ یاد ہوگیا تھا، وہ انٹرمیجیٹ ہی میں تھے کہ اقبال کے بڑے معترف ہوگئے تھے، شکوہ اور جواب شکوہ ان کو زبانی یاد تھے، زبور عجم برابر ان کو ساتھ رہتی، وہ اقبال کی خودی اور بے خودی سمجھانا شروع کرتے تو میں بڑا خفیف بنا ان کی باتیں سنتا، اور زبان حال سے کہتا رہتا کہ یہ لڑکا سن بلوغ کو ختم کرنے سے پہلے ہی اب پختہ عمر کو پہونچ گیا ہے،

ان کو علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بڑا قلبی لگاؤ رہا، ان ک
ہر بات پر وجد کرتے، ان کی شہرت کو دیسنہ کی شہرت اور ان کی سربلندی
کو دیسنہ کی سربلندی سمجھتے، اسی لئے وہ معارف ضرور پڑھتے اور اس کے
شذرات کے جان دار اور موثر ٹکڑے دوسروں کو زبانی سناتے
حضرت سید صاحب کے بہت سے مضامین اور کتابیں انٹرمیجیٹ کی طالب
ہی کے زمانہ میں پڑھ ڈالی تھیں، اس وقت سید صاحبؒ کی خطبات مدر
بہت مشہور ہو رہی تھی، وہ اس کو پڑھ کر جھومتے، اور دوسروں کو سنا کر جھو
پر مجبور کرتے، اسی زمانے میں انھوں نے حضرت سید صاحب کے بہت سے
لطیفے بھی سنائے، ان ہی کی زبانی سنا کہ جب سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی خلاف
کا وفد لیکر لندن گئے تو حضرت سید صاحب بھی ساتھ تھے، لندن میں
وہ کرایہ کے ایک مکان میں مقیم تھے، ان کی میزبان ایک میم تھی، وہ ہر صبح
کو دن اور رات کے کھانے کا مینو پوچھ لیا کرتی تھی، اور سید صاحب ہی اس
بتا دیا کرتے تھے، مولانا محمد علی سید صاحبؒ کو مولانا کہہ کر پکارتے تھے، تو میم
سمجھتی کہ مولانا ان کا نام ہے، اس لئے ان کو مسٹر مولانا کہا کرتی تھی، ایک د
مولانا محمد علی نے سید صاحب سے کہا کہ آج اس خاتون سے کہہ دینا کہ کھانے
میں مرغ ہو، میم نے حسب دستور سید صاحب سے پوچھا کہ آج کھانے میں
کیا ہوگا، تو سید صاحب تین ہجے میں مرغ کی جو انگریزی تھی، دی

بول اٹھے، ہیم جر انغ یا ہوئی، مولانا محمد علی سے جاکر شکایت کی کہ آج مسٹر مولانا کو کیا ہو گیا ہے کہ جو مجھ سے بدتمیزی پر اُتر آئے ہیں، مولانا محمد علی نے سید صاحبؒ کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے کچھ تو نہیں کہا مرغ کے لئے جو انگریزی لفظ ہوتا ہے، اسی کو دہرا کر کہا یہ پکنے کو کہا ہے، مولانا محمد علی نے سُن کر قہقہہ لگایا، پھر سید صاحب کو بتایا کہ اس لفظ کا یہاں کیا مفہوم ہوتا ہے،

اسی سلسلہ میں عاشق مرحوم نے بتایا کہ مولانا محمد علیؒ کی زبان پر جو فقرہ آجاتا اس کو کہے بغیر نہیں رہتے، کہنے لگے کہ جب ۱۹۲۶ء کا خلافت کا وفد حجاز گیا تو سید صاحب اس کے صدر تھے، اور سید صاحب ہی کا بیان ہے کہ وہاں موتمر اسلامی میں امیر شکیب ارسلان بھی عراق کے خاص نمائندے بن کر آئے ہوئے تھے، ان کو وہاں عراق کا عضو مخصوص کہا جاتا تھا، ایک ایرانی نمائندہ ان کو تلاش کرتا ہوا، مولانا محمد علی کے پاس پہونچ گیا، اور ان سے پوچھا "عضو مخصوص عراق کجا باشد" مولانا محمد علی نے ایک خیمہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "شاید درآں مقام مخصوص خواہد باشد"

عاشق مرحوم ہی کے بیان سے معلوم ہوا کہ جب مولانا محمد علی اور اور سید صاحب حجاز سے واپس آئے، تو دونوں میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا،

Scanned by CamScanner

مولانا محمد علی نے ایسی تحریریں لکھنی شروع کیں، جو سید صاحب کے خلاف پڑتی تھیں، سید صاحب ان دنوں دہلی گئے، مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، تو سید صاحب نے ان سے فرمایا، "آپ جتنا بھی لکھیں گے، میں خاموش رہوں گا، مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا، میں لکھ کاہے کو رہا ہوں آپ کو خاموش کرنے ہی کیلئے تو لکھ رہا ہوں،

عاشق مرحوم نے یہ بھی بتایا کہ ایک بار سید صاحب اپنے وطن دیسنہ میں تھے، تو اسی زمانہ میں وہاں ایک بارات باہر سے آئی، دولہا میاں دروازے لگے تو رسم کے مطابق گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑا دلہن کے دروازے پر آکر کھڑا ہوا، تو دولہا میاں کے والد بزرگوار گھوڑے کے عقب میں دکھائی دیئے، سید صاحب بھی وہاں موجود تھے، مگر ذرا دور کھڑے تھے، لیکن اس وقت اپنی تمام متانت اور سنجیدگی کو قطع نظر کر کے دولہا کے والد سے بلند آواز سے مخاطب ہو کر بولے "حضرت خیال رہے، کہیں گھوڑا دُم نہ مار دے۔"

عاشق مرحوم ہی سے یہ معلوم ہوا کہ ایک بار سید صاحب دیسنہ میں ایک صاحب کے گھر پر ملنے گئے، تو ان کو پان پیش کیا گیا، لیکن صاحب خانہ نے زردہ کے بجائے خانہ ساز تمباکو پیش کیا، اس کو لے کر سید صاحب نے فرمایا "آپ کی یہ خانگی بھی خوب ہے۔"

عاشق مرحوم کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی

رہی، اپنی قابلیت اور ذہانت کے سہارے کبھی کبھی شعر بھی کہتے رہتے اقبال کے بڑے شیدائی تھے، اس لئے ایک روز ان ہی کے طرز پر "خطاب بہ مسلم" کے عنوان سے ایک پوری نظم فارسی میں کہہ ڈالی، میرے اصرار پر انھوں نے یہ نظم مولانا محمد علی کے مشہور روزنامہ ہمدرد میں بھیجدی، مولانا محمد علی نے ایک طالب علم کی کاوش سے متاثر ہوکر اس کو ۱۳ نومبر ۱۹۲۷ء کے ہمدرد میں شائع کیا، اس سے عاشق مرحوم کی قابلیت کا سکہ ہم لوگوں پر اور جما انھوں نے جب یہ نظم لکھی تو ان کی عمر سترہ سال کی تھی، وہ نظم یہ تھی،

خطاب بہ مسلم

بہ تتبع ڈاکٹر اقبال

اے قوم کجا بودی واکنوں تو کجائی — اے قوم چہا بودی واکنوں تو کجائی

گہہ ناز جہاں بودی واکنوں تو کجائی — در قعر مذلت توئی، اے قوم کجائی

اے قوم کجائی؟ اے قوم کجائی؟

در شیشہ گہہ مستی بدی شیشہ نایاب — در شیشہ آشامے بود چو لعل گراں کمیاب

در باغ جہاں بودی نہال تر و شاداب — اے وائے خزاں آمدہ، حالِ خود شد رباب

اے قوم کجائی؟ اے قوم کجائی؟

اقوام و ملل را تو بدی ابر بہاراں　　از ریگ شدہ بر، تو بہ قلزم ہمہ جاری
تو زیست را داری ہمہ ایں نوری و ناری　　اکنوں تو افسردہ شدی اے قوم کجائی

اے قوم کجائی؟ اے قوم کجائی

ہر خطہ در سینہ گیتی ہمہ از تست　　ہند است ترا، چین ترا، اندلس ہمہ از تست
ایں حکمت و ایں فلسفہ دانش ہمہ از تست　　اکنوں اے طبیب جہاں علت ہمہ از تست

اے قوم کجائی؟ اے قوم کجائی؟

مسلم شدہ برباد ز دارائی افرنگ　　مسلم شدہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
مسلم شدہ مجبور ز تیموری افرنگ　　مسلم شدہ رنجور ز فغفوری افرنگ

اے قوم کجائی؟ اے قوم کجائی

وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں انٹرمیجیٹ کے امتحان میں شریک ہوئے تو پورے صوبہ میں ان کی پوزیشن دوم تھی، ہملوگوں کو یقین تھا کہ وہ میٹرک کے امتحان کی طرح پھر اوّل آئیں گے، لیکن دوم پوزیشن بھی لانا کوئی معمولی کامیابی نہ تھی، ایک بار پھر ہملوگ ان کے اس غیر معمولی کارنامہ پر خوش تھے، میں بھی انٹر پاس ہو کر مظفرپور سے پٹنہ آگیا تھا، گو میں درجہ میں ان سے ایک سال آگے رہا، لیکن ہم دونوں کا برابر کا اٹھنا بیٹھنا ساتھ ہو گیا، ہم دونوں پٹنہ کالج میں تعلیم پانے لگے، ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ خطبات مدراس کا ترجمہ انگریزی میں کر دیں، یہ خطبات سید صاحب

کی انشا پردازی کے بھی بہترین نمونے ہیں، ترجمہ میں انشا پردازانہ رنگ کا آنا بہت مشکل تھا، اس لئے میں نے ان سے کہا کہ بی اے پاس ہو جاؤ تو یہ ہمت کرو، لیکن ان کی سیمابی طبیعت کب اتنے دنوں کا انتظار کر سکتی تھی، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے بتایا کہ وہ پوری کتاب کا ترجمہ ختم بھی کر چکے، میری حیرت کی انتہا نہ رہی، انھوں نے اس کو حضرت سید صاحب کے پاس دارالمصنفین اعظم گڈھ بھیجا، انھوں نے اس کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پاس دیکھنے کے لئے بھیجدیا، ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ تھے، انھوں نے اس پر یہ رائے لکھ بھیجی کہ ترجمہ تو اچھا ہے، لیکن اس میں تحریر کی پختگی نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایک انٹر پاس طالب علم میں تحریر کی پختگی کہاں سے آسکتی تھی، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ کہدینا کہ ترجمہ اچھا ہے، عاشق مرحوم کی ابتدائی کوشش کا سب سے بڑا صلہ تھا، یہ ترجمہ انھوں نے خود بعد میں Living Prophet کے نام سے ڈھاکہ سے سنہ ۱۹۶۰ء میں شائع کرایا، اسی کے بعد انھوں نے انگریزی ہی میں بچوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح میں ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھی،

سنہ ۱۹۳۸ء کی گرمیوں کی تعطیل میں ان کو حضرت سید صاحب نے دارالمصنفین اعظم گڈھ بلا کر خطبات مدراس کے ترجمے میں اپنی نگرانی میں کچھ ترمیم کرائی، وہ دارالمصنفین جا کر تقریباً دو مہینے رہے، وہاں سے وہ پٹنہ آئے تو

دارالمصنفین کے بزرگوں کی زبانی سنے ہوئے بہت کچھ لطائف وظرائف تحفے میں لائے، اور اپنی مجلسوں میں سنا کر ہم لوگوں کو محظوظ کرتے رہے،

ان کا بیان ہے کہ حضرت سید صاحبؒ ایک روز دستر خوان پر بڑی اچھی گفتگو کر رہے تھے، اسی گفتگو میں فرمایا کہ وہ علی گڈھ گئے تو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے یہاں ٹھہرے، ایک شام کو دونوں ساتھ باہر نکلے تو سامنے ایک میدان تھا، جہاں کئی گدھے گھاس چر رہے تھے، سید صاحبؒ نے ان گدھوں کو دیکھ کر رشید احمد صدیقی صاحب سے کہا کہ علی گڈھ میں گدھے بہت ہیں، رشید احمد صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ جی ہاں کچھ باہر سے بھی آگئے ہیں، یہ بیان کرکے سید صاحبؒ خود بھی ہنسنے لگے،

عاشق مرحوم نے کہا کہ حضرت سید صاحبؒ ہی کی زبانی سنا کہ ایک جلسہ میں وہ اور مولانا ابوالکلام آزاد شریک تھے، مغرب کا وقت آیا تو جلسہ نماز کے لئے ملتوی کر دیا گیا، جاڑے کا زمانہ تھا، سید صاحبؒ عمامہ باندھے ہوئے تھے، اور گرم شروانی پہنے تھے، وضو کے لئے عمامہ اتارا تو اس کے نیچے کشتی نما ٹوپی بھی تھی، جو عام طور سے گاندھی ٹوپی کے نام سے مشہور ہے، مولانا ابوالکلام کی نظر اس پر پڑی تو سید صاحبؒ سے فرمایا، بہت خوب، آپ نے مذہب اور قومیت دونوں کو ساتھ جمع کر رکھا ہے، سید صاحبؒ نے برجستہ جواب دیا لیکن قومیت نیچے ہے، مذہب اوپر ہے،

عاشق مرحوم کے اعظم گڈھ کے قیام کے زمانہ میں سید صاحب کے بھتیجے، اور اردو کے مشہور مصنف مولانا ابوظفر صاحب ندوی بھی کچھ دنوں کے لئے اعظم گڈھ آگئے تھے، ان کی زبانی عاشق مرحوم نے سنا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جب الندوہ کے سب اڈیٹر تھے، وہ (یعنی مولانا ابوظفر صاحب ندوی) بھی وہیں تھے، اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد بہت کم سن تھے، ایک روز مولانا ابوظفر صاحب نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کیا عمر ہوگی تو بہت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "جتنی آپ کے والد بزرگوار کی ہے۔" پھر مولانا ابوظفر صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ فجر کی نماز کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد کی آنکھیں نہیں کھلتی تھیں، ایک روز انھوں نے مولانا سے کہا کہ آپ کی فجر کی نماز برابر قضا ہو جاتی ہے، مولانا نے بہت ہی متین اور باوقار لہجہ میں اس کا یہ جواب دیا کہ خداوند تعالیٰ اور اس کے رسول کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ حشر میں اس کی پرسش آپ سے نہیں ہوگی مجھ سے ہوگی، عاشق مرحوم کا بیان ہے کہ یہ واقعہ سنا کر مولانا ابوظفر ندوی صاحب خود ہنسنے لگے،

عاشق مرحوم ہی کی روایت تھی کہ شعر الہند کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے بیان کیا کہ جب وہ کلکتہ میں الہلال کے دفتر میں کام کرتے تھے تو ان کی میز کے پاس ایک خادمہ کی پانچ چھ برس کی بچی آجایا کرتی تھی، وہ ان سے پیسے مانگتی تو وہ اس کو ایک دو پیسے دے دیا کرتے تھے، ایک روز

اس بچی کو وہ پیسے دے رہے تھے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی نظر پڑ گئی، تو مسکرا کر بولے "مولانا ابھی بہت دنوں تک انتظار کرنا پڑیگا"

ہم لوگوں کی طالب علمی کے زمانہ میں پٹنہ کالج میں انگریزی ہندوستانی استادوں کے علاوہ تین انگریز آرمر، اکٹر لونی اور جے اے ہل بھی پڑھاتے تھے، عاشق مرحوم سے ملاقات ہوتی تو کبھی ارمر، کبھی اکٹر لونی، اور کبھی ہل بن کر لکچر دینا شروع کر دیتے، وہ پروفیسر ہل سے بہت متاثر تھے، ان کے درس کا گن گاتے رہتے، ان کے تلفظ، ان کی قابلیت، ان کے انشا پردازانہ فقرے اور جذبات سے بھر کر انگریزی نظموں کے پڑھنے کے طریقے کو بیان کر کے ایک سماں باندھ دیتے، ہندوستانی استادوں میں کے ہی، ہوگی انگریزی پڑھاتے تو انکی آواز کلاس میں چاندی کے سکوں کی کھنکھناہٹ کی طرح گونجتی رہتی، عاشق مرحوم ان کی اس آواز کے فدائی تھے،

کالج میں ان کو بڑی شہرت حاصل رہی، کیونکہ وہ غیر معمولی استعداد کے طالب علم ہونے کے ساتھ بہت اچھے مقرر بھی تھے، مسلمان طلبہ میں اس زمانہ میں فضل الرحمٰن، کلیم الدین اور سید حسن بھی بڑے اچھے طلبہ تھے، ان تینوں نے یونیورسٹی میں پوزیشن لا کر شہرت حاصل کی تھی، اور یہ سب پٹنہ کالج کے پروفیسر بھی ہوئے، لیکن ان میں کوئی اچھا مقرر نہ تھا، عاشق مرحوم کالج کے ہر مباحثہ میں شریک ہوتے، پلیٹ فارم پر آتے تو افلاطون

ارسطو، بائبل، شیکسپیئر، ملٹن، کارلائل، لارڈ ایکٹن، برناڈشا اور اسٹوین وغیرہ کے فقروں اور مقولوں سے ان کی تقریر معمور رہتی، بار بار تالیاں بجتیں، تالیوں کی گونج میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جاتے، اور مدح و ستائش، سے بے نیاز ہو جاتے، وہ مباحثوں کے مقابلہ میں کالج اور یونیورسٹی کی طرف سے بنارس اور علی گڈھ بھی بھیجے گئے اس زمانہ میں ہماری اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ جلاس بڑے اہتمام سے ہونے تھے، جن میں تقریری مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا، ان کو اس ایک تقریری مقابلہ میں طلائی تمغہ بھی ملا، ایک بار وہ کالج میں تقریر کر رہے تھے، پورا ہال بھرا ہوا تھا، اگلی صف میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر تارے پورے والا اور پروفیسر لیئق احمد نیر بھی بیٹھے تھے، جو آکسفورڈ سے تازہ وارد تھے، میں ان دونوں کے پیچھے بیٹھا تھا، عاشق مرحوم تقریر میں اپنی گل فشانی کا پورا جوہر دکھا رہے تھے، پروفیسر لیئق احمد نیر نے ان کی تقریر سے متاثر ہو کر پروفیسر تارے پورے والے سے چپکے سے کہا کاش یہ لڑکا ہمارے شعبۂ تاریخ کا طالب علم ہوتا، تو ہم لوگ اس پر فخر کرتے، پروفیسر تار پور والا نے کہا، وہ تاریخ کے آنرز کلاس کا طالب علم تو نہیں لیکن تاریخ پاس کورس کا طالب علم ہے اس لئے یوں بھی ہم لوگ اس پر فخر کر سکتے ہیں، ان دونوں کی یہ گفتگو سن کر مجھکو بہت خوشی ہوئی، میں نے اس کو عاشق مرحوم سے دہرایا تو انھوں نے

سنی اَن سنی کر دی گویا یہ کوئی بڑی تعریف نہیں، سچ تو یہ ہے کہ وہ تعریف
پروف تھے، ان کی بڑی سے بڑی مداحی ہوتی، لیکن کہیں سے ان میں پندار کا
جذبہ پیدا نہیں ہونے پاتا، ان کی یہ بے نیازی آخر وقت تک قائم رہی،
ان کی تقریری صلاحیت کے ساتھ ان کی تحریری لیاقت بھی بڑھتی
جا رہی تھی، ان کے انگریزی مضامین کالج میگزین میں ضرور شائع کئے
جاتے، اس زمانہ میں جس طالب علم کا مضمون اس میں شائع ہوتا، وہ بڑی
عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا، اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہو جاتیں،
عاشق مرحوم تو اس کے اڈیٹوریل بورڈ میں بھی شریک کر لئے گئے جو بہت
ہی نمایاں طالب علم کو یہ عزت حاصل ہوتی، طلبہ کی نگاہوں میں ان کی وقعت
دو اہم موقعوں پر اور بھی بڑھ گئی، ایک موقع تو وہ تھا جبکہ پٹنہ کیا بلکہ ہندوستان
کے مشہور بیرسٹر سر علی امام کا انتقال ہوا، کالج میگزین کے اڈیٹوریل بورڈ
کی طرف سے ان پر ایک تعزیت نامہ لکھے جانے کی تجویز منظور ہوئی، انگریزی کے
استادوں سے یہ درخواست کی گئی، تو انھوں نے بالاتفاق عاشق مرحوم
سے لکھنے کو کہا، اور جب انھوں نے یہ تحریر لکھی، تو استادوں نے اس کی تعریف
کی، اور یہی میگزین میں کالج کی طرف سے شائع ہوئی، دوسرا موقع وہ تھا
جب کالج کے پرنسپل مسٹر ہارن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پرو وائس چانسلر
ہو کر یہاں سے رخصت ہونے لگے تو اسٹاف کی طرف سے ان کو الوداعی

سپاسنامہ پیش کیا جانے والا تھا، اسٹاف کے ممبروں نے عاشق مرحوم کو یہ سپاسنامہ لکھنے کو کہا، قلم کے اس دھنی نے انگریزی میں ایسا عمدہ سپاسنامہ لکھا کہ اسی کو پروفیسر سرن نے اسٹاف کلب کے سکریٹری کی حیثیت سے پڑھا، جو انگلستان سے اسی زمانہ میں واپس ہو کر کالج کے شعبۂ معاشیات میں استاد مقرر ہوئے تھے،

اس وقت تک عاشق مرحوم کو انگریزی میں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ ایک روز میں تقریباً چمبرس ڈکشنری لے کر ان کے سامنے بیٹھ گیا، اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان سے مشکل سے مشکل الفاظ کے معانی پوچھتا رہا، وہ ہر لفظ کے صحیح معانی بتاتے رہے، اس زمانہ میں انھوں نے انگریزی میں نظمیں بھی کہنی شروع کر دی تھیں، جو پٹنہ کالج میگزین میں برابر چھپتی رہیں، بعد میں ان نظموں کا مجموعہ Wings of Fancy کے نام سے شائع کیا،

انگریزی زبان و ادب پر گفتگو آتی، تو پھر اپنی معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ فراہم کر دیتے کہ ہم لوگوں کے لئے یہ درس ہی ہو جاتا، میں نے انگریزی زبان و ادب سے متعلق بہت کچھ انہی کی صحبت اور رفاقت میں سیکھا، اور وہ کچھ ایسے دل نشین انداز میں اپنی باتیں پیش کرتے کہ ان کی بہت ساری باتیں اس طرح ذہن میں محفوظ ہیں، جیسے انھوں نے مجھکو ابھی ابھی بتائی ہیں، انھوں نے شکسپیر کے تمام ڈرامے پڑھ ڈالے تھے، ایک روز شکسپیر پر گفتگو

آئی تو کہنے لگے کہ اس کے ڈراموں میں بڑی آفاقیت Universalism ہے، بڑی رنگارنگی ہے، اسکی باریک بینی اور قوت آخذہ کی تعریف کرنی پڑتی ہے، اس کی نظر انسانی اوصاف و ذمائم کے تمام پہلوؤں پر تھی، اسی لئے اس کے ڈراموں میں نیکی و بدی، رحم و ظلم، ایثار و بدنفسی، مسرت و حسرت، نشاط و غم، دیانت داری و دغابازی، سچ اور جھوٹ، معصومیت و فریب کے بے مثال نمونے ملتے ہیں، اس کو اپنے آرٹ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اسلئے وہ بادشاہ کی بادشاہت، شیطان کی شیطنت، ولی کی ولایت، مسخرے کے تمسخر، عاشق مہجور کے اضطراب، معشوق کی کج ادائی، مفسدوں کی فتنہ انگیزی، ظالموں کی سفاکی اور دوستوں کی دلداری کی بہت جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے، اس کے ڈرامے آنسوؤں اور قہقہوں دونوں کے مجموعے ہیں، رومیو جولیٹ ایک لیریکل ٹریجڈی ہے، ہملٹ میں بروٹس سیاسی آئیڈیلیزم اور خود ہملٹ ذہنی آئیڈیلیزم کے نمونے ہیں کنگ لیر میں کائناتی ٹریجڈی (Cosmic tragedy) اور اوتھیلو تو بہت ہی Pathetic tragedy ہے، پھر وہ شیکسپیر کی کامیڈیوں کی قسمیں بتانے لگے، ہم لوگوں کے نصاب میں A Midsummer Night's dream اور Merchamt of venice تھیں لہٰذا ان دونوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ (A Midsummer Night's dream) میں

صحرائی (Sylvan) اور ہجویہ (Satirical) کامیڈی
کا لطف ضرور ملتا ہے، لیکن مرچنٹ آف وینس میں ظرافت کی جو پختگی ہے
وہ اس میں نہیں، ظرافت کی یہی پختگی Much adoabout
No thing, As you-like it, اور Twelfth Night
میں ملتی ہے، ان کامیڈیز میں ان کو Twelfth Night زیادہ
پسند تھی، The two Gentlemen of Verona
اور The comedy of Errors، All love's
labour lost کے متعلق کہتے ہیں، کہ ان میں طفلانہ رنگ
کی ظرافت محض الفاظ کے سہارے کی گئی ہے ان کو The Merry
wives of windsor اور The Taming of
shrew پسند نہ تھی، کہتے کہ یہ ڈرامے محض تفنن طبع کی خاطر
لکھے گئے، شکسپیر کے سنجیدہ ڈراموں میں Measure for Measure
اور All's well that ends well کو پسند کرتے
اس کے تاریخی ڈراموں میں جولیس سیزر کی تعریف کرتے اور کہتے کہ شکسپیر
نے تاریخی ڈرامے رچرڈ سکنڈ اور ہنری فورتھ وغیرہ لکھ کر یہ آرٹ دکھایا
ہے، کہ تاریخ کے پورے واقعات کو وہ اپنے پانچ ایکٹ کے ڈرامے میں موثر
طریقے سے پیش کر سکتا ہے، وہ کہتے کہ ان کی نظر میں ہیملٹ، اوتھیلو، میکبتھ

اور کنگ لیر شیکسپیر کے آرٹ کے بہترین نمونے ہیں، ان میں جذبات کی شدت اور گہرائی کے ساتھ نفسیاتی ژرف نگاہی، اور باریک بینی ہی، انکا طرز ادا اور انداز بیان بھی سب ڈراموں سے اونچا ہے، وہ یہ بھی کہتے کہ شیکسپیر نے نئے ٹائملاگ، پورشیا، رومیو جولیٹ، پک، فال اسٹاف، ہیملٹ اور بروٹس کے جو کیرکٹر دیئے ہیں، وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، اور پھر بڑے یقین کے ساتھ کہتے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کی یہ خوبی ہے کہ ان کو لکھے ہوئے صدیاں گذر گئیں، مگر ابھی تک شوق سے پڑھے جاتے ہیں، ان میں کہنگی نہیں پیدا ہوئی ہے اور وہ خود کہہ گیا ہے،

My bounty is as boundless as the see

یعنی میری فیاضی کی حد کی تھاہ سمندر کی طرح ہے،

ایک روز کہنے لگے کہ شیکسپیر نے انگلستان اور انگریزی ادب میں جو مقام حاصل کر لیا ہے، اسکا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ کارلائل نے لکھا ہے کہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کی سلطنت زیادہ عزیز ہے کہ شیکسپیر، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ خواہ ہندوستان کی سلطنت نکل جائے، مگر انگریز شیکسپیر کا دامن نہیں چھوڑ سکتے،

اسی طرح انگریزی زبان کے اور شاعروں اور ادیبوں کے متعلق گفتگو کرتے تو کہتے کہ ملٹن کا درجہ شیکسپیر سے تو ضرور کم ہے، لیکن جہانتک فن شاعری

کا تعلق ہے، وہ انگریزی شاعری کے آرٹ کی تکمیل کے لئے پیدا کیا گیا، اسکی
رزمیہ شاعری (epic) و ode (گیت) sonnet masoque
اور elegy کا جواب انگریزی شاعری میں نہیں، وہ بعد کی نسلوں کے
ذہن پر ضرور چھایا رہا، لیکن کسی سے اس کی تقلید نہ ہو سکی، وہ بڑا مذہبی واقع
ہوا تھا، اس کی مذہبیت کی وجہ سے انگریزی زبان کو Paradise Lost
جیسی زندہ جاوید کتاب ملی جو اگرچہ بارہ جلدوں میں ہے، مگر اس کے حسن بیان،
موسیقیت، ترنم اور cadence میں کہیں کمی واقع نہیں ہوتی ہے،
انگریزی زبان میں ایسی کتاب پھر نہیں لکھی گئی، گو شاعروں نے اس کی نقل
کرنے کی کوشش کی، مگر ملٹن کی فکر کی رفعت تک پہونچتے پہونچتے ان کا
پر پرواز جل کر رہ گیا، وہ مستقل ایک عہد کا بانی تھا، اور گو وہ آخر میں نابینا
ہو گیا تھا، لیکن اس کے ذہن کی شاعرانہ بصیرت برابر قائم رہی،

ولیم ورڈسورتھ کے متعلق کہتے کہ اس کے بعض ناقد اس کی بعض نظموں کو
ادنی اور معمولی درجہ کی کہتے ہیں، لیکن اس کی زیادہ تر نظمیں بیان اور زبان
دونوں لحاظ سے بہت حسین ہیں، وہ جذبات کو صرف چھیڑ کر چھوڑ دیتا ہے،
ان کو زیادہ برانگیختہ اور عریاں کر کے پیش کرنے کا قائل نہیں، اسکے جو سانیٹ
انگریزی شاعری کے راس المال ہیں، اسکی منظر نگاری میں اندرونی مسرت
اور روحانی عشرت حاصل ہوتی ہے، اس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

Scanned by CamScanner

بادلوں اور ہواؤں کے دوش پر ہیں، وہ بڑا خوددار بھی واقع ہوا تھا، جب اس کو Poet Laureate کے خطاب سے نوازا گیا، تو اس نے اس کو اس شرط پر قبول کیا کہ اس سے حکومت کوئی نظم یا اشعار کہنے کی فرمائش نہ کرے۔

کولرج کے متعلق کہتے کہ اس کی قوتِ متخیلہ بہت تیز تھی، زبان کی جادوگری میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں، آسمان اور سمندر کے واقعات کی مصوری میں اس کو لذت ملا کرتی تھی، قدرت کے مشاہدے کے لئے وہ چشم بینا رکھتا تھا، اس کی شاعری کے آرٹ میں مشکل سے کوئی نقص نکال سکتا تھا،

بائرن کے متعلق کہتے کہ اس کی شاعرانہ صلاحیتیں طنزیہ نظمیں لکھنے میں زیادہ نمایاں ہوئیں،

شیلے کے متعلق کہتے کہ اسکی غنائیہ شاعری Lyrics میں حسن Beauty اور Passion اور sublimity پورے طور پر پائے جاتے ہیں اس کو مکان Space اور Infinity کی مصوری میں لذت ملتی ہے

کیٹس سے وہ بہت متاثر تھے،، اور کہتے اس کی وفات پچیس ۲۵ سال کی عمر میں ہوگئی،، اسی عمر میں اس نے نظمیں لکھ کر اپنے زندہ جاوید ہونے کا سامان کر گیا ہے، وہ کچھ نہ لکھتا، تو صرف اس کا یہ مصرع اسکو ہمیشہ زندہ رکھتا،

A thing of beauty is a joy forever

اس کے Lyrics کے مقابلہ میں عظیم تر Greater lyrics تو

ضرور ہیں، لیکن اس سے زیادہ حسین تر Lovelier نہیں ہیں،
ٹینی سن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اس کی نظموں میں sound
sense, sensation کے ساتھ alliteration
اور vowel music کے بھی لطف ملتے ہیں،" ان ہی خوبیوں
کی بدولت Tennysonian adornment کی خاص
اصطلاح ہو گئی ہے، لیکن اس کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ Poet Laureate
بنا دیا گیا تھا، جس کی بنا پر اسکو بعض مسائل حاضرہ پر بھی نظمیں کہنی پڑتی تھیں،
اسی لئے کسی نے اسکو اپنے زمانہ کا اخبار Newspaper of
this age کہہ کر اسکی تحقیر کی تھی، لیکن فٹز جیرالڈ نے اسکے متعلق یہ بھی کہا
ہے کہ اس کے تخیلات میں نہ صرف اچھے سمندر بہتے ہیں بلکہ ان میں اچھی پہاڑیاں
اور وادیاں بھی دکھائی دیتی ہیں،

وہ ادیبوں میں جان بنین (John Bunyan) سے زیادہ
متاثر تھے، کہتے کہ اسکی ایلگری (تمثیلی تحریریں) بے مثال ہیں، جن کو سمجھنے
میں کوئی دقت نہیں ہوتی، اس کی سادگی انگریزی طرز ادا کا شاہکار ہے،
جان بنین The Pilgrim's Progress کی طرح جوناتھن
سوفٹ کی Gulliver's travels بھی ایک تمثیلی کتاب ہے،" اور
ان ہی نے مجھے بتایا کہ یہ کتاب سوئفٹ کے اس فقرہ کی تفسیر ہے،

I heartily hate and detest that animal called man.

اس نے اپنی اس کتاب میں انسان کو بد معاش، Insolent
اور کم ظرف کی حیثیت سے پیش کیا ہے،

اڈیسن کے متعلق کہتے کہ وہ گناہگاروں اور بدکاروں سے نہیں، بلکہ گناہ اور بدکاری سے نفرت دلاتا ہے، سموئیل جانسن کے متعلق ان کا بیان تھا کہ شروع میں اس نے مشکل، مغلق اور غیر مانوس الفاظ ضرور لکھے جس سے Johnsonian style کی اصطلاح بھی بن گئی، لیکن بعد میں اس کی تحریریں سلیس اور ہلکی ہو گئیں، وہ اپنے طرز ادا کے لئے ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھا جائیگا،

ہم لوگوں کی طالب علمی کے زمانہ میں برنا ڈشا کے عجیب و غریب بیانات اخبارات میں شائع ہوا کرتے تھے، جو عام رائے کے بالکل خلاف ہوتے، اس کے بیانات پر ایک روز گفتگو ہونے لگی تو عاشق مرحوم نے کہا کہ انگلستان میں اس کو صرف ایک ہی آدمی سمجھتا ہے، وہ چسٹر ٹن ہے، اسی لئے اس نے کہا کہ جو لوگ برنا ڈشا کو نہیں سمجھتے ہیں، وہ اس کی تعریف کرتے ہیں، میں اس کو خوب سمجھتا ہوں اس لئے اسکی تعریف نہیں کرتا ہوں،
People who dont understand him

appreciate him, I understand him
I therefore do not apprecide him

کہنے لگے کہ ایک مشہور حسین ایکٹرس نے برناڈشا کو یہ خط لکھا کہ میں تم سے شادی کرنے کی خواہاں ہوں اسلئے کہ ہم دونوں کی جو اولاد ہوگی، اسکو تمہارا دماغ اور میرا حسن عطا ہوگا، تو وہ دنیا کے لئے عجیب چیز ہوگی، برناڈشا نے اس ایکٹرس کو جواب دیا کہ تم کو غلط فہمی ہوئی، میری تمہاری شادی سے جو اولاد ہوگی اس کو میرا تو چہرہ مہرہ ہوگا، اور تمہارا دماغ، اس جواب کا لطف ایسے ہی ناظرین کو ہوگا، جنھوں نے برناڈشا کے بد قطع چہرہ کی کم از کم تصویر ہی دیکھی ہوگی،

عاشق مرحوم نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایک خاتون نے برناڈشا کو لکھا کہ میں اپنی مفلسی کی وجہ سے آپ کی کتاب خرید۔ نہیں سکتی ہوں، اسلئے مجھ کو اپنی تصنیف A Guide to socialism for intelligent woman ہدیۃً عنایت کریں، برناڈشا نے جل کر جواب دیا کہ میں مفلسوں کے لئے کتابیں نہیں لکھتا ہوں اس لئے مفلسوں کو میری کتاب پڑھنے کا حق نہیں، اس خاتون نے برناڈشا کے اس خط کو ایک ناشر کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، تو اس کی اتنی قیمت ملی کہ اس نے برناڈشا کی کتاب بھی خریدی، اور کچھ رقم بھی بچالی، اور اس کی خبر

Scanned by CamScanner

برنارڈ شا کو بھی دیدی،

یونیورسٹی میں اس زمانہ میں طلبہ کے درمیان لوفر کی اصطلاح چلی ہوئی تھی، وہ ایک دوسرے کو کبھی تفریح اور کبھی غصہ میں لوفر کہا کرتے تھے، عاشق مرحوم کی نکتہ رس طبیعت لفظ لوفر پر بہت گلفشاں ہو جاتی، وہ کہا کرتے کہ ایک جینیس (عبقری) کے لئے لوفر ہونا ضروری ہے، اس موضوع پر ان کی زبان چلتی تو روکے نہیں رکتی، کہتے کہ شکسپیر بڑا ہی لوفر تھا، وہ اپنی جوانی میں سر لوسی کے ہرن کی چوری کر کے لندن بھاگ گیا، مارلو کی موت ایک شرابخانہ میں ہوئی، ملٹن جب چالیس ۴۰ سال کا تھا، تو ایک چودہ برس کی لڑکی کو بیاہ کر کے گھر لے آیا تھا، جو اس سے کچھ ایسی وحشت زدہ ہوئی کہ جب باپ کے گھر گئی تو ملٹن کے پاس کسی دام پر واپس نہیں آئی، ملٹن نے تو اپنے سے چھبیس ۲۶ برس کم عمر کی لڑکی پر ڈورے ڈالے، اور حضرت سیموئیل جانسن نے اپنے سے بیس ۲۰ سال زیادہ عمر کی ایک عورت کو تاکا، اور اسی سے شادی کی، گوئٹے نے اپنی شادی کے لئے ایک ایسی لڑکی کو منتخب کیا جو اس سے ۲۶ برس چھوٹی تھی، گولڈ اسمتھ کی لوفرزم کی تو کوئی حد نہ تھی، وہ شراب اور شراب حسن دونوں کا متوالا تھا، جواڑی بھی تھا، جس کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہا، بائرن بہت بڑا شاعر تھا، لیکن اس کو ایک نئی نویلی دلہن کی زبانی اسکے شب زفاف کی کہانی کو منظوم کرنے میں بڑا لطف ملا، شیلے پر دو لڑکیوں

کے اغوا کا الزام ہے،

اسی طرح اردو کے شاعروں کے بارے میں کہتے کہ غزل گویوں کے شہنشاہ میر تقی میر کا کام دہلی کے کج کلاہ لڑکے تمام کرتے رہے، اور معلوم نہیں انھوں نے کتنے "سیم تن" پر اپنے جان و مال کے ساتھ سو جی کو صدقہ کیا اور اور وہ جو یہ کہہ گئے ہیں کہ دل تڑپے ہے، جان گھلے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا، چھاتی جلا کرے ہے، سینے میں جیسے دل ملا کرے ہے، اک آگ سی رہے ہے، کیا جانئے کہ کیا ہے، یہ سب کیا ہے، ایک پری تمثال عزیزہ کے ساتھ عشق کا اظہار ہے، اگر مانو تو عشق ورنہ لوفرزم، سودا اردو قصیدہ نگاری کے امام سمجھے جاتے ہیں، لیکن غنچہ نامی ان کا ایک غلام تھا، ہر وقت ساتھ رہتا تھا، اور قلمدان لئے پھرتا تھا، جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے، ارے غنچہ لا تو قلمدان، ذرا میں اس کی خبر لوں، یہ مجھے سمجھا کیا ہے، پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منھ کھول کر وہ بے نقط سناتے کہ شیطان بھی پناہ مانگتا، جس سے شیطان بھی پناہ مانگے وہ کون ہو سکتا ہے،؟ خواجہ میر درد سراپا درد تھے بڑا نام پیدا کیا، صوفیانہ اشعار کہتے تو بقول محمد حسین آزاد معلوم ہوتا کہ تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر رہے ہیں، لیکن ان کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں، ان پر کوئی اعتراض کرتا تو کہتے کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں، میر سوز بڑے آن بان کے شاعر تھے، ایک بار سلام اللہ خاں کے ڈیرے پر گئے تو وہاں کئی طفل پری رو کو دیکھ کر ارے ارے

رے، ارے رے رے، ارے رے رے کہتے ہوئے بیہوش ہو گئے، جرأت اردو غزل گوئی میں معاملہ بندی کے امام سمجھے جاتے ہیں، ان کے شاعرانہ کمال میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا ہے، مگر ایک نواب صاحب کے ملازم ہوئے تو بیگمات کے حسن کے دیدار سے آنکھوں کو سکھ پہنچانے کے لئے یہ اعلان کر بیٹھے کہ ان کی آنکھیں بصارت سے محروم ہیں، اور اس جھوٹ سے واقعی آنکھوں کو رو بیٹھے، انشا اردو شاعری کے گلستان کے ایک چہکتے ہوئے بلبل سمجھے جاتے ہیں، ان میں جو علمی فضل و کمال تھا، وہ بہت کم شاعروں میں رہا، محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ انشا فن انشار کی قلمرو میں بادشاہ علی الاطلاق تھے لیکن جب وہ مصحفی کی ہجویں لکھتے تو ان میں فحاشیوں کی نجاست بھری رہتی، پھر حضرت مصحفی کو لیجئے کہ بڈھے پھوس ہو گئے، تو پھر شادی کی اور بقول محمد حسین آزاد طبیعت کی رنگینی نے مستی کی مدد سے دانتوں کو رنگین کیا تھا، مومن تو ایک پردہ نشین ہی کا دم بھرتے رہے، لیکن ڈرتے بھی رہے کہ کہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے، اور حضرت غالب تو اس فن کے استاد الاساتذہ تھے، ناؤ نوش کی عادت پڑی تو مرتے دم تک نہ چھوٹی، ہاتھوں کی جنبش جاتی رہی تھی، صرف آنکھوں میں دم تھا، پھر بھی ساغر و مینا آگے رکھے رہتے، وہ تو بہشت کو صرف بادہ گلفام و مشکبو کے لئے عزیز رکھتے تھے، اور ایک ستم پیشہ ڈومنی پھر شیریں اور صنم جیسی طوائفوں کے عشق میں نکمے ہو کر رہ گئے تھے، اور نہ وہ بھی آدمی تھے

کام کے، اپنی کام جوئی میں دوسروں کو بھی تلقین کرتے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، اس تخیل سے ان کا کلیجہ منہ کو آتا تھا، کہ اگر بہشت میں ایک قصر ملا، اور ایک حور ملی، تو یہ ایک حور اجیرن ہو جائیگی، وہ اپنی بیوی کو تقویم پارینہ سمجھتے رہے، ان کو اپنے معشوقوں کی گالیاں سننے میں بڑی لذت ملتی، ان کی گالیاں (بھی) سنتے، پھر بھی ان کی دعائیں صرفِ زبانی رہتیں، وہ عاشق ضرور ہوتے، لیکن معشوق فریبی سے کام لیتے، اور حضرت قمار بازی میں تو اسیری کے دن بھی جیل خانے میں کاٹ آئے تھے،

عاشق مرحوم اسی طرح لوفرازم پر گفتگو کر کے اس میں علمی اور ادبی شان پیدا کر دیتے، علم و ادب کے ساطیر ہی سے مثالیں نہیں دیتے بلکہ تاریخ کے مشاہیر کی مثالوں کا بھی انبار لگا کر لطفِ بیان اور لطفِ مجلس دونوں ہی پیدا کر دیتے، اس موضوع پر ان کا ایک انگریزی مضمون بھی پٹنہ کالج میگزین میں شائع ہوا تھا، اس میں انداز بیان کچھ اور تھا، اس میں انہوں نے انگریزی میں بہت اچھے اچھے جملے لکھے، مثلاً،

The loafer is a genius. He is a superman in many respects, He is no slave to the trammels of convention. He is rebel against society. He

preaches the doctrine of freelove in Shellyan fashion. His genius does not reck public opinion. The urge in himind for some new adventure is always strong, Life always opens to him with great adventures with the glorious vision of a new Atlantis or a New Jerusalem. He is always serious for not being serious. He is a moon truck chap. There is a wave of divine lunacy in his psychological make up. He believes that to keep going is to go on.

اس موضوع پر ان کی گفتگو مختلف موقع پر نو بہ نو کے ساتھ نوع بہ نوع
بھی ہوتی۔

وہ ابھی بی۔اے کے طالب علم ہی تھے کہ پٹنہ میں آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کا ایک اجلاس ہوا، اس کے جلسے پٹنہ کالج ہی کی عمارتوں میں ہوئے، عاشق مرحوم نے اردو کے عناصر اربعہ کے عنوان سے اس کے شعبۂ اردو کے لئے ایک مضمون لکھا جو قبول کر لیا گیا، شعبۂ اردو کی صدارت صلاح الدین خدا بخش مرحوم نے کی، اور اس میں علامہ سلیمان ندوی، بابائے اردو ڈاکٹر عبد الحق، ڈاکٹر ہادی حسن (مسلم یونیورسٹی) ڈاکٹر نظام الدین (عثمانیہ یونیورسٹی) ڈاکٹر عبد الحق (مدراس یونیورسٹی) اور شمس العلماء ہدایت حسین (کلکتہ یونیورسٹی) وغیرہ حاضرین کی حیثیت سے موجود تھے، عاشق مرحوم نے ان مشاہیر کی موجودگی میں اپنا مضمون پڑھا، اور ان تمام ارباب نظر نے اس کمسن طالبعلم کی لیاقت کی داد دی، جس کو میں نے رشک آمیز خوشی کے ساتھ سنا،

وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب خطبات مدراس کا انگریزی ترجمہ ختم کر چکے تو ان کی دوسری مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" کا ترجمہ انگریزی میں شروع کرنے لگے، اس کے کچھ حصے ترجمہ کر کے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں بھیجے اُس وقت اس کے اڈیٹر مارماڈیوک پکتھال تھے جو (Meaning of the Glorious Quran) کے مصنف کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں، انھوں نے ان کا انگریزی ترجمہ پسند کیا اور اسلامک کلچر میں اس کی مختلف قسطیں ۱۹۳۵ء تک شائع ہوئی۔

جس سے ان کی طالب علمی کے زمانہ کی قابلیت وصلاحیت کے طرہ ہائے امتیاز میں اور بھی اضافہ ہوا،

جب وہ یہ انگریزی ترجمہ ختم کر چکے تو انھوں نے شکسپیر کے ڈرامہ Twelfth Night کا ترجمہ اردو میں کرنا شروع کیا، اور تھوڑی مدت میں اس کا ترجمہ بھی ختم کر دیا، جو بعد میں ۱۹۴۱ء کے رسالہ ندیم گیا میں "خوش انجام" کے عنوان سے شائع ہوتا رہا، لیکن افسوس ہے کہ "عرب وہند کے تعلقات" کے انگریزی اور شکسپیر کے ڈرامہ کے اردو ترجمے کتاب کی صورت میں ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکے،

ان کے کچھ مضامین اخبار ہمدرد روزانہ دہلی، البشیر ہفتہ وار پٹنہ، اور بچوں کے رسالہ غنچہ بجنور میں بھی چھپے،

ان کو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں علمی، ادبی اور رومانی تحریریں لکھنے کی اچھی خاصی مہارت ہو گئی تھی، رومانی انداز میں انھوں نے ایک تحریر نغمۂ حور کے عنوان سے لکھی، یہ پہلے تو رسالہ ندیم گیا میں چھپی پھر اسی کو لاہور اور بمبئی کے رسالوں نے نقل کیا، اس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:-

(۱) نقرئی آواز والی مغنیہ اسٹیج پر آئی، تو قبل اس کے کہ اپنے سحر آگیں نغموں سے محفل پر سکوت، اور بیہوشی کی ایک کیفیت طاری کر دے،

اس نے اپنے ایک تارِ نظر میں تمام محفل والوں کے دلوں کو منسلک کر لیا، اقدری قیامت! اس کا رنگ چاندی کی طرح چمک رہا تھا، اس کی آنکھیں شراب حسن کے دو چھلکتے ساغر تھے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی، دونوں رخسار حسن ازل کی تفسیریں تھیں، زلفوں میں اژدر کا پیچ اور شب ہجراں کی تیرگی تھی، نقرۂ خام کے دو نازک ستونوں پر معمار ازل نے یہ نازک عمارت کھڑی کی تھی، اس کے بلوریں سینہ پر اس کی زلفوں کے تموج میں حسن کا سمندر لہریں لے رہا تھا، مجموعی اثر ایک سحر کامل اور افسون ہوشربا تھا،

"طوطی کہا جائے، بلبل کہا جائے، قمری کہا جائے، ان میں سے کوئی لفظ بھی آواز کی دل آویزی اور موسیقی کی دل پذیری کے بیان کرنے کے لئے کافی نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ چاندی کے دو سکوں کی باہمی آمیزش سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسی کے پردہ میں لپٹے ہوئے نغمے نکل رہے تھے، تو بیجا نہ ہوگا، اسکے ہونٹوں سے نغمے نکل کر آتش پارے بن جاتے تھے، جن سے دنیا کی جگرسوزی ہو رہی تھی، اس کا ایک ہلکا سا تبسم صبر و ایمان کے کاروان کی رہزنی کر رہا تھا، صبر و شکیب کے خرمن پر اس کا

تبسم بجلیاں گرا رہا تھا، سننے والے عقل و ہوش کا سرمایہ، اور دانائی و فرزانگی کی متاع کھو رہے تھے،

مطرب بہ نغمہ دشمنِ ایمان آگہی
ساقی بہ جلوہ رہزنِ تمکینِ ہوش ہے

حاضرین خود فراموشی اور مدہوشی کے عالم میں سانس لے رہے تھے، اللہ رے بیہوشی! عقل و خرد کی تمام دولت نثار ہو رہی تھی پھر جس کے تبسم اور پھر ہلکے سے تبسم کا یہ حال ہو، اُس کا طرزِ تکلم کیا ہوگا،

تبسمش تکلّمے، تکلمش ترنّمے
سزد اگر تلاطمے بجان تشنہ دہانے زند

اور پھر اس کے ترنم کا کیا پوچھنا، ہر زیر و بم کی آغوش میں سیکڑوں نہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں قیامتیں پرورش پا رہی تھیں،

مطربہ تسخیر قلوب کے تمام حربوں کے ساتھ آکر بیٹھی، ادھر مضراب پر انگلیاں چلیں، اور اُدھر روح کی تمام تانیں کھنچ گئیں، معلوم ہوا کہ مضراب ساز روح پر کوئی زخمہ سا لگا رہا ہے، جب تک وہ پری پیکر نغمہ سنجی میں مصروف رہی، پورے مجمع پر اک نشہ کی کیفیت تھی، گویا ایک ایک حرف نے اپنے صوت سرمدی سے لوگوں کو مست و بیخود بنا دیا تھا، اس کی آنکھیں جدھر بھی اٹھ جاتیں ادھر ہر شخص سکتہ کے عالم میں آجاتا،

تھا، اس کی آنکھوں کی کیف آور صہبائے آتشہ کی تاثیر رکھتی تھی،
ہر شخص مست و مدہوش نظر آتا، جب وہ ایتری کا نغمۂ بربط اپنی غزل
گا چکی ...... تو سارے مجمع پر جو ابھی بیہوشی کے عالم
میں تھا، ہوش کی لہریں دوڑنے لگیں، ایک اور ایک اور کے
سقف شگاف نعرے بلند ہونے لگے،

وہ نازک اندام رو کشِ خورشید و قمر پھر بیٹھ گئی، اور اپنے
شیریں، دل آویز، حشر آفریں نغموں سے مجلس کی سامعہ نوازی
شروع کر دی، اور فوراً یہ اثر کان کے پردوں سے نکل کر
قلب و دماغ کی قلمرو میں پہونچ گیا، معلوم ہوا کہ پھر ساقی کے
لطف و کرم نے مجمع کو مستِ صہبائے بیہوشی بنا دیا، آواز
کی دلکشی اور مطربہ کی جاذبیت کے ساتھ اس کے چشم و ابرو
کے اشاروں میں تخیل کے سامنے نئے گلفام کے ساغر چھلکتے
ہوئے نظر آئے،

غزل ختم ہو گئی، اور وہ پھر جانے کو اٹھی، لیکن پھر وہی
اصرار، اس کا گا کر اٹھ جانا، اور پھر لوگوں کے اصرار سے
اس کا محض لوگوں کی دلجوئی کے لئے بیٹھ کر نوا سنجی کرنا، یہ سلسلہ
قریب ایک گھنٹہ تک قائم رہا، اس کے روح پرور نغموں کو

سُن کر اقبال کا شعر لوگوں کی زبانوں پر آ رہا،

این صورت دل آویزے از زخمۂ مطرب نیست

مہجورِ جاں حورے نالہ بہ رباب اندر"

طالب علمی میں ان کے اٹھان کے آگے میں اپنی کوئی حیثیت نہیں سمجھتا رہا، ان مضامین کو دیکھ کر میں بھی کوئی مضمون لکھنے کی کوشش کرتا اور ان کو دکھاتا تو زبان اور انداز بیان کی اتنی اصلاحیں دیدیتے کہ میں بددل ہو کر اپنی کم مائیگی پر ملامت کرتا، لیکن ان کی صحبت میں جو غیر شعوری فوائد حاصل ہوئے، اس کا اندازہ بعد میں ہوا

اس زمانہ کی سیاست میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا شوکت علی مولانا محمد علی، محمد علی جناح اور مولانا ابو الکلام آزاد کا ذکر برابر آتا، عاشق مرحوم ان کی تقریریں اخبار میں پڑھتے، تو ان کو زبانی دہرا دیتے، وہ زیادہ تر اسٹیٹسمین پڑھتے، اور اسکے اڈیٹوریل کو اس طرح زبانی سناتے کہ معلوم ہوتا کہ دیکھ کر پڑھ رہے ہیں، پھر ان کی گفتگو میں لطف اس لئے پیدا ہو جاتا کہ کسی نہ کسی لیڈر کے متعلق کوئی لطیفہ ضرور بیان کرتے جاتے، ایک روز کہنے لگے کہ گاندھی جی کسی جلسہ کی صدارت کر رہے تھے، اس میں اس زمانہ کی ایک بہت مشہور خاتون لیڈر کی بھی تقریر ہونے والی تھی، جب ان کی باری آئی تو گاندھی جی نے ان کا تعارف اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کرایا، جلسہ کو مخاطب کر کے ان کا نام لیتے ہوئے

Scanned by CamScanner

کہا کہ وہ اپنا فرض بجا ئیں گی یعنی (بجا لا ئیں گی) لیکن فرض کے ض کے بجائے ج بول گئے،

ان ہی کی روایت ہے کہ ایک بار پنڈت موتی لال نہرو کسی جلسہ کی صدارت کر رہے تھے، اس میں مسز سروجنی نائیڈو اور وٹھل بھائی پٹیل بھی تقریریں کرنے والے تھے، مسز سروجنی نائیڈو کی باری آئی تو پنڈت موتی لال نہرو نے جلسہ سے مخاطب ہو کر کہا، کہ بلبل ہند آپ سے مخاطب ہونگی، جب انکی تقریر ختم ہو گئی تو وٹھل بھائی پٹیل کی باری آئی پنڈت نہرو نے جلسہ سے کہا کہ بلبل ہند کے بعد اب ہندوستان کے چنڈول آپ سے مخاطب ہونگے، وٹھل بھائی پٹیل کی داڑھی بڑی لمبی تھی، اسی مناسبت سے پنڈت نہرو نے ان کے لئے یہ لفظ استعمال کیا،

پنڈت موتی لال نہرو کی نفاست مزاج کا ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ جب گیا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، تو پنڈت موتی لال نہرو کے خیمے کے سامنے باتھ روم بھی تھا، وہ باتھ روم گئے تو وہاں کچھ بدبو تھی فوراً واپس آگئے مجلس استقبالیہ کے لوگوں کو بلایا اور کیوڑے کی کئی بوتلیں منگوا کر باتھ روم کو دھلوایا، پھر ان کے استعمال کے قابل ہوا،

ایک بار گاندھی جی کی غذا کی سادگی کا موضوع تھا کہ وہ صرف بکری کا دودھ پیتے ہیں، اور پھل کھاتے ہیں، عاشق مرحوم نے بتایا کہ گاندھی جی کے پاس

Scanned by CamScanner

پاس ہمیشہ دو بکریاں ہوتی ہیں اور جہاں وہ جاتے ہیں ریل پر ان کے ساتھ بکریاں بھی جاتی ہیں، اس کے بعد انھوں نے کہا کہ جی، ڈی، برلا ان کے کھانے پینے کے اخراجات برداشت کرتے ہیں، اور برلا کا بیان ہے کہ گاندھی جی کے کھانے پینے کے اہتمام میں پچاس ہزار روپیہ سالانہ خرچ ہوتے ہیں،

ایک روز مولانا شوکت علی مرحوم زیر بحث آگئے، عاشق مرحوم نے بتایا کہ ایک بار مولانا شوکت علی پٹنہ تشریف لائے، تو پٹنہ میں فریزر روڈ کی کوٹھی سکندہ منزل میں ان کی دعوت تھی، جس میں وہ شیر برنج کی ۳۳ پیالیاں ایک وقت میں کھا گئے، عاشق مرحوم ہی کا بیان ہو کہ گرمیوں کے موسم کے رمضان شریف میں مولانا افطار کرتے وقت شربت گلاس میں نہیں پیتے بلکہ جگ میں پیتے اور کئی جگ پی جاتے، سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے عاشق مرحوم نے کہا ایک بار مولانا شوکت علی علی گڈھ میں اولڈ بوائز ڈنر میں شریک تھے، ان کے بغل میں ان کے ہم جماعت اور دوست زین الدین صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر بیٹھے تھے، جن کی داڑھی سرسید کی داڑھی سے بھی بڑی تھی، مولانا شوکت علی بریانی کھا چکے تو میٹھا کھانے کے لئے دوسری پلیٹ مانگی، اس کے آنے میں دیر ہوئی، تو زین الدین صاحب نے کہا اب زیادہ کون انتظار کرے، اور ان کی داڑھی پکڑ کر اپنی نمکین چاول کی پلیٹ صاف کرنے لگے، زین الدین صاحب چیخے اور چلائے انھوں نے بھی بے تکلفی میں اپنی پلیٹ اٹھا کر مولانا شوکت علی پر دے ماری،

Scanned by CamScanner

مولانا نے جھٹ پیٹھ پھیر دی، پلیٹ مولانا کی پیٹھ سے ٹکرا کر دو ٹکڑے ہو گئی،

عاشق مرحوم ہی کی روایت ہے کہ مولانا شوکت علی نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں چندہ جمع کرنے میں ہر قسم کی دوڑ دھوپ کی، ایک بار اپنے ایک دوست کے لڑکے کی شادی میں شریک ہوئے، لڑکے کو سلامی میں بڑی رقم ملی، مولانا شوکت علی کے منھ میں پانی آگیا کہ کسی طرح یہ رقم مسلم یونیورسٹی کے لئے لینا چاہیئے، یکایک مجمع میں اٹھے، اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہا، آپ کو سن کر خوشی ہوگی، کہ لڑکے کے والد بزرگوار نے سلامی کی پوری رقم مسلم یونیورسٹی کو دیدی ہے، ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں اتنی بلند ہوئیں کہ لڑکے کے والد اس کی تردید نہ کر سکے،

مولانا شوکت علی کے ساتھ مولانا محمد علیؒ کا ذکر بھی ضروری آجاتا، ایک روز عاشق مرحوم نے سنایا کہ حضرت مولانا سید سلیمانؒ ندوی کہتے تھے کہ جب خلافت کا وفد مولانا محمد علیؒ کی رہنمائی میں لندن گیا ہوا تھا، تو اسی زمانہ میں ترکی سے ایک وفد آیا ہوا تھا، مولانا محمد علی نے اس وفد سے ملنا چاہا، لیکن برطانوی حکومت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ملی، مولانا محمد علی نے کوشش کی کہ کم از کم ان کی طرف سے کوئی تحریر اس وفد کے پاس پہنچ جائے، جس سے خلافت سے متعلق اس کو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات معلوم ہو جائیں، انھوں نے ایک تحریر مرتب کی اور آدھی رات کے بعد اپنی قیامگاہ سے باہر نکل گئے، ترکی وفد کے ہوٹل کے پاس پہنچے، وہاں لانسٹر تو

کا پہرہ تھا، مولانا محمد علی کو انگریزی بولنے پر بڑی قدرت حاصل تھی، سنتریوں سے وہاں کی مقامی بولی میں مخاطب ہوئے، پھر چپکے سے چند اشرفیاں ان کے ہاتھوں میں رکھدیں، اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ یہ تحریر ترکی وفد تک پہنچادیں اور انھوں نے واقعی پہونچادی، یہ کہہ کر عاشق مرحوم نے کہا رشوت کہاں نہیں چلتی، عاشق مرحوم کو مولانا محمد علی کے چٹکلے بہت یاد تھے، ایک روز کہنے لگے کہ مولانا محمد علی نو چینجرز تھے، وہ انگریزوں کی اسمبلیوں اور کونسلوں میں داخل ہونے کے خلاف تھے، لیکن موتی لال نہرو نے کانگریس سے تجویز منظور کرا کے ایک سوراج پارٹی بنائی اور اسمبلیوں اور کونسلوں کی رکنیت پر قابض ہو گئے، ایک روز دہلی کی لیجسلیٹو اسمبلی کا تماشہ دیکھنے کے لئے مولانا محمد علی اس کی گیلری میں جا بیٹھے ان کے ایک سوراجی ممبر دوست نے ان کو وہاں دیکھا، تو اسمبلی ہال سے ان کو مخاطب کر کے کہا، "یہاں تک آپ آئے ہیں تو دو قدم اور سہی"، مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا،

I prefer to look down upon you

ایک اور موقع پر مولانا محمد علی عربی لباس پہن کر اسمبلی تشریف لے گئے، پنڈت مدن موہن مالوی نے ان کو دیکھا تو کہا، "اچھا آپ مولانا محمد علی ہیں" میں توسمجھا کہ بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لارہی ہیں، مولانا محمد علی نے فوراً کہا کہ بیگم صاحبہ بھوپال جیسی شیر دل خاتون اس زنانہ مجلس میں آنا پسند نہیں کرتی ہیں، اسی

موقع پر وہ آگے بڑھے تو لیجسلیٹیو اسمبلی کے صدر مسٹر وٹھل بھائی پٹیل تھے جنھوں نے ان کا تعارف ایک انگریز سے کرایا، انگریز نے ملتے ہی ان سے کہا کہ مولانا! آپ تو بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں، مولانا محمد علی نے جواب دیا "شکریہ، جب تک انگریزی لباس پہنتا رہا یہ کسی نے نہیں کہا کہ میں انگریز معلوم ہوتا ہوں لیکن آج اپنے رسولؐ کے ہموطنوں کا لباس پہن کر آیا ہوں تو اس کی برکت سے آپ مجھکو عرب کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں"

عاشق مرحوم نے بتایا کہ جب مولانا محمد علی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو کچھ مسلمان کانگریسیوں نے ان کو ٹوڈی بچہ کہا، لیکن مولانا محمد علی اس کے جواب میں مسلمان کانگریسیوں کو دھوتی بچہ کہا کرتے تھے،

محمد علی جناح اس وقت تک قائد اعظم نہیں ہوئے تھے، لیکن اپنی ایمانداری اخلاص، اور رکھ رکھاؤ کے لئے طلبہ میں بھی بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اب کبھی ان کا ذکر آتا تو عاشق مرحوم کہتے کہ انگریز بھی اس کے معترف ہیں کہ وہ بے داغ انگریزی لباس پہنتے ہیں، اور بے داغ انگریزی زبان بولتے ہیں، ایک روز اثنائے گفتگو میں عاشق مرحوم نے بتایا کہ محمد علی جناح کسی انگریز مجسٹریٹ کی عدالت میں بحث کر رہے تھے، انگریز مجسٹریٹ نے اثنائے بحث میں جھلا کر ان سے کہا "مسٹر جناح! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کو مخاطب کر رہے ہیں" محمد علی جناح نے برجستہ جواب دیا "یور آنر، آپ کو بھی

معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کا مخاطب ایک فرسٹ کلاس بیرسٹر ہے،

عاشق مرحوم ہی نے بتایا کہ محمد علی جناح اپنی ابتدائی زندگی میں کچھ دنوں کے لئے بمبئی پریسیڈنسی میں مجسٹریٹ کے عہدہ پر بھی مامور رہے، لیکن اس عہدہ سے ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی، صوبہ کی حکومت ان کو سبکدوش کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لئے ان کو ترقی دیکر ان کی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار کردی گئی، لیکن انھوں نے یہ عہدہ یہ کہہ کر منظور نہیں کیا کہ میں پندرہ سو روپے ماہانہ کے بجائے پندرہ سو روپیہ روزانہ پیدا کرونگا، اور انھوں نے یہ کر کے دکھا دیا، اپنی بیرسٹری کے زمانے میں معلوم نہیں کتنی دولت پیدا کی جس کا اندازہ لگانا مشکل ہے،

عاشق مرحوم کہتے کہ محمد علی جناح چاہتے تو وائسرائے کے ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر آسانی سے ہو سکتے تھے، وہ کسی صوبہ کے گورنر بھی بنائے جا سکتے تھے، لیکن انھوں نے کسی دام پر انگریزوں کے ہاتھ فروخت ہونا نہیں چاہا، بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن سے ان کی جو جنگ ہوئی، اس کی تفصیل ہم لوگوں کو سناتے اور کہتے کہ اس جنگ میں محمد علی جناح کو فتح ہوئی، اور اس خوشی میں بمبئی میں ولنگڈن ہال کے بجائے وہاں کے عوام نے جناح ہال بنایا، ان ہی سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ سروجنی نائیڈو محمد علی جناح کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا کرتی تھیں، مگر ہندو بیریس آخر میں ان کو فرقہ پرستی کا علمبردار کہنے لگا، اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جتنا

ان کو ہندو پریس برا کہتا، اتنا ہی وہ مسلمانوں میں مقبول ہوتے گئے،

عاشق مرحوم بی اے کے پہلے سال میں تھے کہ ان کی شادی گاگاؤں کے ایک بہت معزز خاندان میں ہو گئی، ان کے خسر جناب صدیق حسن صاحب موتیہاری کے بڑے ممتاز مختار تھے، سرسید احمد خاں کی تحریک کے حامی تھے، اس لئے ان سے ان کا ملنا جلنا بھی رہا، اپنے بڑے لڑکے مظفر امام صاحب مرحوم کو ام، اے، او کالج میں تعلیم دلائی، جب کابل کے بادشاہ امیر حبیب اللہ خاں ہندوستان کے دورہ کے سلسلہ میں علی گڈھ آئے، تو مظفر امام صاحب نے ان کی کچھ ایسی خدمت کی کہ ان کی سفارش پر وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے، لیکن جوانی میں وفات پا گئے، جس کا قلق گاگاؤں والوں کو اب تک ہے، مختار صاحب مرحوم کی شکل اور داڑھی بھی سرسید احمد خاں کی طرح تھی، انھوں نے اپنے اور لڑکوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائی، جنہیں احمد امام مرحوم انسپکٹر پولیس اور محمد امام صاحب سول سرجن ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں، اس خاندان میں ڈھائی درجن تو ام، بی، بی، اس ڈاکٹر ہیں، عاشق مرحوم کے بڑے ہم زلف ڈاکٹر صلاح الدین صاحب بھی بہت اچھے ڈاکٹر ہیں، جو اس وقت چھپرہ میں پریکٹس کر رہے ہیں، ان کی بیوی کے سنجھلے بھائی علی امام بھی ڈاکٹر ہیں، اور ان سے چھوٹے بھائی اختر امام پولیس میں انسپکٹر ہیں، اور سب سے چھوٹے بھائی صفدر امام نے علی گڈھ میں بی، اس سی تک تعلیم پائی ہے، اس خاندان سے منسلک ہونے کے بعد عاشق مرحوم خوش تھے، لیکن شادی کے بعد ان کو غیر شعوری طور پر یہ بھی محسوس

ہونے لگا کہ کتابوں کے ڈھیر میں رہ کر اور چراغ دود نیم شبی کے سامنے بیٹھ کر
کی لطافتیں تو مل سکتی ہیں، لیکن رفیقۂ حیات کی وجہ سے بھی صبح حسین، شام رنگین
اور رات سحر آگیں بنائی جا سکتی ہے وہ جلد ایک بچہ کے باپ بھی ہو گئے، جب
اپنی ماں کی آغوش سے ہمک کر ان کی گود میں چلا جاتا تو ان کو خیال ہوتا کہ یہ
ہمک زندگی کا اصلی راس المال ہے، ان کا بچہ ان کی چارپائی پر آ کر ان کی چھاتی
پر بیٹھ جاتا، اور اس کی ماں ان کی چارپائی کے پاس مسکراتی ہوئی کھڑی ہوتی
تو اس وقت وہ یہی سمجھتے کہ وہ اصلی حیات اور ساری کائنات کے مالک بنے
ہوئے ہیں، ان کے نصاب کی کتاب میں ٹامس ہارڈی کا ایک ناول
Under the greenwood tree تھا، وہ جزئی
طور پر اپنی ازدواجی زندگی ایک Greenwood tree کے سایہ
میں دیکھنے کے خواہاں ہو گئے، انھوں نے شیکسپیر کے بہت سے ڈرامے پڑھے
اپنی ازدواجی زندگی میں رومیو کی رومانیت اور انٹونیو کی جذباتیت چاہنے
لگے، ان کے فارسی نصاب میں سعدی اور حافظ کی غزلیں بھی تھیں، ان کی اندر
خواہش یہ پیدا ہونے لگی کہ غزلوں کی شعریت اور کیفیت بلکہ ان کا تغزل
نغمہ اور ترنم ان کی زندگی میں بھی ہو، وہ زندگی کو حقیقت منتظر کے بجائے
اس کو لباس مجاز میں دیکھنے کے خواہاں ہو گئے، اقبال کی ایک غزل کا مطلع
جو اس کے ہم معنی ہیں، وہی انھوں نے ایک خط میں بیوی کو بھی لکھ بھیجا تھا، اس

لکھتے وقت مجھکو بھی دکھایا،

وہ جب بی اے کے دوسرے سال میں تھے تو ان کی خود اعتمادی کو ایک بڑا صدمہ پہنچا، وہ انگریزی میں بی اے آنرز کر رہے تھے، ان کا ہم جماعت ایک اینگلو انڈین بھی تھا، انگریز پروفیسر اس کی طرف مائل تھے، عاشق مرحوم کو خیال ہوا کہ یونیورسٹی کے امتحان میں انگریز پروفیسروں کی جانبداری سے یہ اینگلو انڈین ان سے بازی لے جائیگا، اس لئے جب یونیورسٹی کے امتحان کا وقت آیا تو تمام لوگوں کے اصرار کے باوجود وہ امتحان میں شریک نہیں ہوئے، اس امتحان کی عدم شرکت سے ان کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا،

انھوں نے کالج میں پھر داخلہ لیا تو اس سال ایک راجہ کا لڑکا ان کا ہم جماعت تھا، وہ انگریزی کے بی۔ اے آنرز میں اول پوزیشن لانا چاہتا تھا اس لئے انگریزی کے پروفیسروں کو اپنا ٹیوٹر مقرر کر رکھا تھا، تمام طلبہ کو یقین تھا کہ وہی اول آئیگا، عاشق مرحوم کے اعصاب پر پھر اثر ہوا، لیکن وہ ایک سال برباد کر چکے تھے، اس لئے ان کو امتحان میں مجبوراً شریک ہونا پڑا، راجہ کا لڑکا اول آیا، اور ان کی پوزیشن دوم تھی، پھر بھی یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی لیکن امتحان ان کے لئے ایک وحشت ناک چیز بن گئی،

انھوں نے بی اے آنرز کرنے کے بعد ام اے انگریزی میں پٹنہ کالج ہی میں داخلہ لیا، جہاں ان کی ذہانت، لیاقت اور خطابت کی شہرت برابر قائم

Scanned by CamScanner

رہی، طلبہ کا عام خیال تھا کہ وہ ام، اے میں فرسٹ کلاس ضرور لائیں گے، جس کے بعد وہ آسانی سے پٹنہ یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے استاد ہو سکتے ہیں یا آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے تو ان کا انتخاب ضرور ہو جائے گا، خود مجھ کو یقین تھا کہ وہ آئی سی ایس میں لے جانے کے بعد حکومت کے کسی بڑے عہدہ پر فائز ہو جائیں گے، مگر زندگی گذارنے کا ان کا مطمح نظر ہی بدل چکا تھا، وہ زندگی کو اپنے اوپر سوار دیکھنا نہیں بلکہ وہ زندگی پر سوار رہنا چاہتے تھے، اور وہ بھی زندگی ایسی ہو جس میں ان کے معیار کے مطابق رنگینی ہو، رعنائی ہو، دلربائی ہو، فکر نہ ہو ماتھے پر شکن نہ ہو، رنج نہ ہو غم نہ ہو غم ہو تو وہ غمِ عشرت ہو، اضمحلال ہو تو جمال افروز ہو، ان کے احساس جمال میں کمی نہ ہو، دنیا خواہ ان کے متعلق کچھ بھی رائے رکھے، لیکن ان کی نگاہوں میں ان کی زندگی کی ہر صبح دل آویز اور ان کی ہر شام دل پذیر ہو، وہ کئی بچوں کے باپ بن چکے تھے، اپنی بیوی بچوں کی جنت میں رہ کر دنیا کی اور شادمانیوں اور کامرانیوں سے بے نیاز اور مستغنی ہو جانا چاہتے تھے، ان کے ام۔ اے کے امتحان کا وقت آیا، تو وہ اس میں شریک نہیں ہوئے، جس سے ہم لوگوں کو بڑا دکھ ہوا،

وہ ایم۔ اے کے دو سال کے دوران میں آئی، سی، ایس کے امتحان میں بیٹھ سکتے تھے، لیکن ٹال مٹول کرتے رہے، اس امتحان کا وقت جاتا رہا،

Scanned by CamScanner

توان کو انڈین پولس سروس کے امتحان کے لئے تیار کیا گیا، امتحان کا وقت آیا
تو وہ اس میں شریک ہونے کے لئے رانچی روانہ ہوئے، لیکن وہاں جانے کے
بجائے کلکتہ پہنچ گئے، جہاں زندگی کے گوناگوں جلوے کبھی چورنگی کبھی فورٹ ولیم
کالج، کبھی ایڈن گارڈن اور کبھی اس کی مختلف سڑکوں اور محلوں میں دیکھے امتحان
کے کمرے کے بجائے ان ہی سیر گاہوں میں انکو زندگی کے نغمے سنائی دیئے،
انگریزی میں
انگریزی کی غیر معمولی قابلیت کے باوجود وہ دوسرے سال انگریزی میں
ایم اے کرنے کے بجائے ایم اے اردو کے امتحان میں شریک ہوئے، اور گو
تیاری مطلق نہیں کی، لیکن اپنی ذہانت اور صلاحیت سے اس میں فرسٹ
کلاس لے آئے، اس کے بعد وہ خوش تھے کہ اب ان کو کوئی امتحان دینا نہ
پڑے گا،

مقابلہ کے تمام امتحانات کے مواقع کھو چکے توان کو ملازمت کی
فکر ہوئی، رانچی میں اوڈٹ اینڈ اکاؤنٹس میں کچھ جگہیں خالی ہوئیں تو انکی
درخواست پر ان کا وہاں ان کا انتخاب ہو گیا، ان کو آڈیٹر کی جگہ ملی،
جو ان کی طبیعت کے مطابق نہ تھی، لیکن اپنی بیکاری دور کرنے کے لیے
اس کو قبول کر لیا، اس میں کچھ امتحانات ہوتے تھے، اگر وہ یہ پاس ہو جاتے
تو پھر انڈین فنانس سروس میں لے لئے جاتے، لیکن امتحان
تو ان کی زندگی کے لئے کینسر بن چکا تھا، وہ شعبہ کے

لازمی امتحانات میں بھی شریک نہیں ہوئے، جس کے بعد ان کا گریڈ وار ایک بہت ہی معمولی جگہ دی گئی، ہم میں سے ہر شخص کو دکھ تھا کہ ان کو کیا ہونا تھا، اور وہ کیا ہو کر رہ گئے ہیں، اسی زمانہ میں کلکتہ کے ...rdnance محکمہ میں ایک اسٹور کیپر کی جگہ خالی ہوئی، انھوں نے اس کے لئے درخواست ... تو اس جگہ کے لئے اپنی تعلیمی کوالی فیکیشن کی وجہ سے لے لئے گئے، تنخواہ بہت زیادہ تو نہ تھی لیکن ان کی رانچی کی ملازمت سے زیادہ تھی، وہ کلکتہ پہونچے تو انھوں نے محسوس کیا کہ جہاں وہ چند روز رہ کر زندگی کے جلووں سے محظوظ ہو چکے ہیں، وہاں ملازمت کرنا زندگی کی اہانت ہے، اس لئے ایک ہفتہ کے اندر اس سے مستعفی ہو گئے لیکن قدرت نے اپنے اس عبقری کی پھر مدد کی، ان کو اس کے بعد ہی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسسٹنٹ نیوز اڈیٹر کی جگہ مل گئی، ان کو وہاں جو تنخواہ ملی اس سے وہ بظاہر مطمئن تھے۔

میں نے اس اثنا میں پٹنہ میں ایم اے کی تعلیم ختم کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا، وہاں سے جامعہ ملیہ دہلی چلا گیا، جہاں چھ مہینے رہا ہونگا کہ میرے بزرگ محترم سید سلیمان ندوی نے مجھکو دار المصنفین بلا لیا، یہاں آکر میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا، حضرت سید صاحب نے مجھکو قلم پکڑنا سکھایا، تو میرے مضامین معارف اور انگریزی کے مختلف رسالوں میں چھپنے لگے، مجھ کو چھپتے دیکھ کر عاشق مرحوم کو خوشی ہوتی، جس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں کرتے

اور جب ملاقات ہوتی تو میری تحریروں پر تبصرہ کرتے میں ان سے کہتا کہ میری
تحریر میں کچھ اچھائی ہے تو وہ تمہاری ہی بدولت ہے، اور اگر نقص ہے تو اسکے
ذمہ دار بھی تم ہی ہو، کیونکہ تم نے اپنا علم مجھ میں منتقل کرتے وقت کچھ بخل سے
بھی شاید کام لیا ہوگا، پھر وہ کہتے کہ تم مقالہ نگار اور مصنف ہوتے ہوئے جواب میں نہ ہوسکو گا
ان کے اس جملہ میں کچھ حسرت ہوتی، جس کو سن کر میں کہتا کہ تم نے اپنے گلے کے جس
ہار کو اتار پھینکا ہے، وہ میرے گلے کا ہار بن رہا ہے،

لیکن جب اپنے اصلی رنگ پر آجاتے، تو ترنگ میں کچھ لکھ ڈالتے ہندوستان
کے مشہور ہفتہ وار انگریزی اخبار السٹریٹڈ ویکلی میں ایک نظم Doctor's Proposal
کے عنوان سے شائع ہوئی، عاشق مرحوم نے اس کو پڑھ کر انگریزی میں
Reply to the Doctors Proposal کے عنوان سے
ایک نظم کہہ ڈالی جو اسی اخبار ۱۹ جون ۱۹۴۲ء میں چھپی، اس نظم سے ناظرین
بھی لطف لیں، اس میں کوئی علمی موشگافی یا ادبی نکتہ آرائی نہیں، تفریحی
رنگ میں نشاط و انبساط کی کیفیت ہے، جو عاشق مرحوم کی طبیعت
پر چھائی رہی، ان اشعار کا لطف اس وقت زیادہ ملتا جب وہ
خود ایک مخصوص انداز میں پڑھتے، پڑھ کر ہنستے، اور سننے والوں
کو بھی ہنساتے،

Scanned by CamScanner

Away with your injection
I do not dread infection
Give me a new frock every week.
To me look all chick and sleek
And I'll love you and live with you
Of liquid parrafin I'll have none
And castor oil I deeply shun
But give me a gown of ocean-blue
A frock of lovely tint and hue
And I'll love you and love with you
Don't talk to me of adenoids
Of medicine, peps and tabloids
But build me a heaven of smell and hue
Of odour, perfume, green and blue-
And I'll love you and live with you

مرحوم اپنی ملازمت کے سلسلہ میں دہلی میں رہے، تو ان کو اپنے فرضِ
منصبی کو ادا کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا، اتفاق ہوا، ہز سلطان
احمد سے ملے، جو اس زمانہ میں وائسرائے کے ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر تھے، قائد اعظم
محمد علی جناح سے ملاقات کی، جو پاکستان تحریک کے روحِ رواں تھے، گاندھی جی،
پنڈت جواہر لال نہرو، لیاقت علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، ولبھ بھائی پٹیل

برا ہنفورڈ کرپس اور پیتھک لارنس کے جلسوں اور پریس کانفرنسوں میں بھی شریک ہوئے،
جس سے انکی نظر بہت وسیع ہوتی گئی، جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو سیاست پر
بڑی ادبی گفتگو کرتے، کوئی ان سے بحث کرتا تو ہندوستان یا انگلستان کے سیاسی
اکابر کی تقریروں کے ٹکڑوں کو زبانی سنا کر اپنے مخاطب کو خاموش کر دیتے،

سنہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہوا تو انھوں نے پاکستان کے
لئے اوپٹ کیا، دہلی میں ان کو ڈھاکہ جانے کا پروانہ ملا، تو وہ دیسنہ بھی آئے،
بس ابھی ان دنوں ایک طویل علالت اور ایک بڑے آپریشن کے بعد وہیں تھا،
گاؤں کے تمام لوگ ان کے ارد گرد بیٹھ جاتے اور دہلی کی سیاسی جوڑ توڑ کاٹ
بڑی گا کی کہانی اس پر جوش کی زبانی سننے میں بڑا لطف آتا،

ان کا بیان تھا کہ دہلی میں قائد اعظم محمد علی جناح مسلمان افسروں اور عہدیداروں
سے بہت شوق سے ملتے، کیونکہ ان سے مفید معلومات حاصل ہوتی تھیں، ایک بار
انھوں نے بھی قائد اعظم سے وقت مانگا، تو طلب کر لیا، پہلے تو وہ ریڈیو سے متعلق سوالات
کرتے رہے، پھر گفتگو کا رخ مڑ گیا، تو قائد اعظم نے کہا کہ جب مجھ سے بمبئی میں مسٹر
گاندھی سے کئی روز مسلسل گفتگو ہوئی، تو ایک روز مسٹر گاندھی نے مجھ سے کہا، "آپ نے
تو مسلمانوں پر اپنی قیادت سے مسمریزم کر دیا ہے، میں نے جواب دیا، ہاں ضرور، اور
آپ جانتے ہیں کہ اس کے اصلی اسباب کیا ہیں، میں کوئی مذہبی آدمی نہیں ہوں،
میری گردن میں تصوف کا کوئی ہالہ بھی نہیں ہے،

(I have not a halo of mysticism, round my necks)

یہ رمضان کا مہینہ ہے، اور میں سگریٹ پی رہا ہوں، مسلمان یہ جانتے ہیں کہ میں روزے نہیں رکھتا ہوں، پھر بھی وہ میری بات مانتے ہیں، اسکی صرف وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں جو باتیں ہوتی ہیں، یا ان کے اندر جو سیاسی جذبات دبے ہوئے ہیں یا جو ان کے اصلی قومی احساسات ہیں، ان کو وہ خود صاف اور واضح طریقے پر بیان نہیں کر سکتے ہیں ان کے دلوں کی باتوں، ان کے دبے ہوئے سیاسی جذبات اور قومی احساسات کی ترجمانی کرتا رہتا ہوں، تو میری ہر بات کو وہ ماننے کے لئے تیار رہتے ہیں، جس روز ان کی صحیح ترجمانی کرنا چھوڑ دونگا وہ مجھ سے اتنا ہی ناخوش ہو جائیں گے، جتنا کہ آج خوش ہیں،

عاشق مرحوم کا یہ بھی بیان تھا کہ قائد اعظم اپنی نجی صحبتوں میں کہتے کہ میں نہ انگریزوں سے ڈرتا ہوں اور نہ ہندوؤں سے، کیونکہ میں ان دونوں کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، مگر میں ڈرتا ہوں تو خود مسلمانوں سے کہ معلوم نہیں یہ کس وقت برگشتہ ہو کر مجھ کو چھوڑ بیٹھیں،

وہ بہت دیر تک مسٹر محمد علی جناح کے اور دوسرے واقعات بیان کرتے چلے گئے، کہنے لگے کہ قائد اعظم اور گاندھی جی ایک ساتھ وائسرائے سے ملنے وائسریگل لاج روانہ ہونے والے تھے کہ گاندھی جی نے ان سے اخلاقاً کہا کہ ان کی موٹر

Scanned by CamScanner

جائیں، دونوں ساتھ چلیں تو اچھا ہے، لیکن قائد اعظم کے یہاں ظاہر داری نہ تھی، "نہیں میری گاڑی موجود ہے، میں اسی پر جاؤنگا"، یہ کہہ کر عاشق مرحوم بولے کہ قائد اعظم بڑے ضدی سیاست داں تھے، لیکن ان کی اسی ضد نے مسلمانوں کی سیاست میں آن بان پیدا کی،

پھر کہنے لگے کہ ایک اور موقع پر گاندھی جی اور قائد اعظم گفتگو کے لئے لارڈ ویول کے پاس پہونچے، تو اس زمانہ میں لارڈ ویول کی صاحبزادی وائسریگل لاج میں بیمار تھیں، گاندھی جی نے اخلاقاً صاحبزادی کا حال پوچھا، اور جب مریضہ کے متعلق مزید سوالات کیئے تو لارڈ ویول نے کہا کہ اگر آپ ان کو دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں، گاندھی جی عیادت کے لیے تیار ہو گئے، اس اثنا میں قائد اعظم خاموش تھے، ان سے بھی لارڈ ویول نے اخلاقاً پوچھا آپ بھی چلنا پسند کریں گے، تو انھوں نے جواب دیا، اس وقت معاملات پر گفتگو کرنے آیا ہوں، عیادت کسی اور موقع پر کروں گا،

عاشق مرحوم نے اسی سلسلہ میں یہ بھی بیان فرمایا قائد اعظم جب حیدرآباد دکن گئے، تو حضور نظام سے بھی ان کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا، وہ حضور نظام کے پاس سگریٹ پیتے ہوئے پہونچے، یہ بات حضور نظام کو ناگوار گذری، انھوں نے اپنی شاہانہ تمکنت سے قائد اعظم سے کہا، آپ کو بادشاہوں سے ملنے کے آداب معلوم ہیں؟ قائد اعظم بھلا یہ کب سن سکتے تھے، انھوں نے جواب دیا،

آپ کو معلوم ہے کہ میں خود دس کروڑ مسلمانوں کا بے تاج کا بادشاہ ہوں، یہ ملاقات اچھی نہیں رہی، پھر بھی حضور نظام نے اپنی طرف سے دستور کے مطابق قائد اعظم کو خاصہ بھیجا، اور پھر ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن قائد اعظم نے حضور نظام کے لئے ایک سخت لفظ استعمال کیا، اور ملاقات سے گریز کیا عاشق مرحوم قائد اعظم کی انگریزی میں خطابت کے بہت قائل تھے، اور بار بار انگلستان کے ایک ممبر پارلیمنٹ کا یہ قول دہراتے کہ وہ بے داغ لباس پہنتے ہیں، اور بے داغ انگریزی بولتے ہیں۔

وہ دہلی کی ملازمت کے زمانے میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سے بھی ملے ان ہی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق اپنی نجی مجلسوں میں بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے جس کی روانی میں وہ ایسے چٹکلے بھی کہہ جاتے، جو سنجیدہ نہ ہوتے، عاشق مرحوم ان کا یہ رنگ دیکھ کر ان سے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو گئے، ان کے یہاں لطیفوں اور بذلہ سنجیوں کی کیا کمی تھی، سلسلہ گفتگو میں وہ اپنے محبوب موضوع لوفرزم پر آ گئے، تو دنیا کے تمام مشاہیر کی لوفرزم کی تفصیل بیان کر ڈالی، ڈاکٹر عبدالحق اس کو سن کر محظوظ ہوئے، اور ان سے کہنے لگے کہ آپ تو اسکینڈل اور لوفرزم کی ڈکشنری ہیں،

عاشق مرحوم نے بتایا کہ بابائے اردو سے ہندوستان سیاست پر باتیں ہونے لگیں تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے کمیونلزم (فرقہ واریت) اور نیشنلزم

(ثنویت) کے مطلب پر جو غور کیا ہے، تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت جو بات کہتی وہ تو کمیونلزم ہے مگر ہندوؤں کی اکثریت جو کچھ کہے، وہ نیشنلزم ہے،

ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بابائے اردو کھانے پینے کے آداب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، ایک بار وہ کسی پرتکلف ایٹ ہوم میں شریک ہوئے، تو ان کی میز پر ایک صاحب آگئے جنھوں نے پہلے پیالی میں چائے بنائی پھر ایک سینڈوچ اٹھاکر چائے کی پیالی میں ڈبونے لگے، یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر سے اچھل پڑے، اور ان صاحب کو مخاطب کر کے کہا،، حضرت آپ نے یہ کیا کر ڈالا، چائے تو ایسی لطیف چیز ہے کہ خراب آدمی کے سایہ سے خراب ہو جاتی ہے" اور آپ نے غضب کیا کہ اس میں سینڈوچ ڈبو دیا،

بابائے اردو کی یہ روایت بھی سنائی کہ وہ ایک دعوت میں شریک تھے، ایک صاحب نے شیر برنج انگلیوں سے کھانا شروع کیا، جس کو ختم کر کے اپنی انگلیاں چاٹنے لگے، کسی نے ان کی طرف دیکھا تو بولے سنت ادا کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر اپنے جھوٹے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں ان صاحب کے منھ کی طرف بڑھا کر کہا حضرت مجھ اور سنت ادا کرکے ثواب حاصل کریں،

عاشق مرحوم دینہ سے ڈھاکہ کے لئے رخصت ہوئے، تو مجھ سے خوب گلے ملے، اور کہنے لگے کہ تم ایک سخت بیماری سے شفا پاگئے، خداوند تعالیٰ اب تم کو ہر طرح

اچھا رکھے گا، کیونکہ تم سے اس کو کام لینا ہے، تقسیم ہند کے انقلاب میں دارالمصنفین کو نہ چھوڑنا، اسی کی خدمت میں لگے رہنا، کیونکہ یہ ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کا متاع عزیز ہے، وہ ڈھاکہ گئے تو وہ پاکستانی کہلانے لگے، اور میں ہندوستانی رہا، ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے غیر ملکی ہو گئے، قدرت اور سیاسی قانون کا یہی فیصلہ تھا،

۱۹۵۵ء کی برسات میں مجھکو ڈھاکہ جانے کا اتفاق ہوا جہاں تقسیم ہند کے بعد میرے بہت سے اعزہ پہونچ چکے تھے، میں وہاں اپنے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر محمد تمیم ام۔ بی۔ بی۔ اس (پٹنہ) اور ڈی۔ ٹی۔ ام اینڈ ایچ (لندن) کے یہاں مقیم ہوا، جن کو میں اپنا حقیقی بھائی سمجھتا رہا ہوں، وہ عاشق مرحوم اور میں تینوں ہم سن ہیں، اس لئے بچپن سے ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت ہی قریب تر رہے، ڈھاکہ اس وقت بہت زیادہ ترقی یافتہ نہ ہوا تھا، لکھنؤ کے بعد وہاں پہونچے میں وہی فرق نظر آیا جو ایک شہر اور قصبہ میں ہوتا ہے، لیکن ڈھاکہ اس لئے دلچسپ نظر آیا کہ وہ اب دوسرا دیسنہ بن گیا تھا، دیسنہ کے بہت سے اعزہ سے ایک جگہ ملنے کا بارہا اتفاق ہوا، لیکن میری ساری دلچسپی عاشق مرحوم کی ذات سے تھی، برادرم تمیم وہاں کے مشہور اور مشغول ڈاکٹر تھے، وہ تفریح کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے، اس لئے میرا وقت زیادہ تر عاشق مرحوم کے ساتھ گذرتا،

Scanned by CamScanner

ان کو ملٹن بازار میں ایک اچھا سا بنگلہ مل گیا تھا، میں ان کے ساتھ پہلی
دفعہ ان کے یہاں گیا تو یہ بنگلہ مجھ کو پسند آیا، پڑوس میں کچھ امریکن اور انگریز
تھے، گھنے دار درختوں کی سرسبزی اور شادابی کے نیچے سے ہو کر اس بنگلہ کا راستہ
تھا، اس کے سامنے ایک تالاب تھا، جس میں آبی پرندے، مچھلیوں کے شکار
میں بیٹھے نظر آتے، دور تک سبزہ کی لہلہاہٹ تھی، ساون کا مہینہ تھا،
اس لئے درختوں پر پپیہے بھی بولتے سنائی دیتے، یکایک مجھکو خیال آیا کہ عاشق مرحوم
کو آخر عمر میں Green wood کے نیچے اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع
مل گیا، انھوں نے مجھ کو بڑے شوق سے اپنے ڈرائینگ روم میں داخل کیا،
وہ زندگی کو پُر تکلف بنا کر اس میں تصنع، ریا اور نمائش پیدا کرنے کے قائل
نہ تھے، ان کے گھر والوں نے ڈرائینگ روم سجا دیا تھا، اس میں جا کر وہ
دوستوں کے ساتھ بیٹھ تو جاتے مگر اس طرح کہ وہ ڈرائنگ روم کے لئے نہیں
ہیں، بلکہ ڈرائنگ روم ان کے لئے ہے، یہی حال ان کے لباس کا تھا، ایک
انگریز شاعر نے لکھا ہے، کہ اس کو اس کی معشوقہ اس وقت زیادہ پسند آتی،
جب اسکی زلفیں پریشان اور منتشر ہو جاتیں، یا جب اس کی پوشاک کی ترتیب
اور بگڑی ہو جاتی یا جب اس کے چہرے اور جسم پر مصنوعی زینت و آرائش نہیں
ہوتی، عاشق مرحوم نے رہنے سہنے اور پہننے میں انگریز شاعر کی اسی معشوقہ کا
رنگ اختیار کر رکھا تھا، ہم لوگ ابھی ان کی بدولت کر ان کی اصلی خوبی اور

Scanned by CamScanner

رعنائی سمجھتے رہے، میں ان کے بنگلہ پر پہونچا تو وہ چیخے، احسان آؤ، نیر آؤ، عذرا آؤ، مصباح آؤ، دوڑو، دیکھو کون آیا ہے، بزمِ تیموریہ اور بزمِ صوفیہ کے مصنف کو دیکھو، میں نے ان کے منھ پر ہاتھ رکھدیا کہ میں مصنف کی حیثیت سے تمہارے یہاں نہیں آیا ہوں، جب ہم لوگ صوفے پر بیٹھ گئے، تو ان کا چھوٹا بچہ ان سے جھپٹ کر ان کی گود میں بیٹھ گیا، ان کی ایک بچی ان کے کاندھے پر لد گئی، وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اب تو تم بھی باپ بن کر زندگی کی ان رعنائیوں کا لطف اٹھانے لگے ہوگے، زندگی کا اصلی لطف ان ہی بچوں کے پیار اور چمکار میں ہے، دفتروں کے فائل میں نہیں، عہدوں کی ترقی میں نہیں، جیبوں میں روپے بھرنے میں نہیں، بینک بیلنس بڑھانے میں نہیں، پھر کہنے لگے کہ مجھے کلاس ون کا گریڈ اب مل گیا ہے، مجھکو کچھ اور نہیں چاہیے، اگر میں کچھ اور چاہوں تو یہ کفرانِ نعمت ہے، پھر گویا ہوئے کہ سکندرِ اعظم سے اس کے ایک بے تکلف دوست نے یہ پوچھا کہ اتنی فتوحات کے بعد آخر کیا ارادے ہیں، تو اس نے کہا کہ ان فتوحات کے بعد چند دوستوں کی ایک مجلس بناؤنگا، اس میں بیٹھ کر لطف و لذت کی باتیں کرتا رہوں گا، دوست نے کہا کہ یہ چیز تو فتوحات کے بغیر بہت آسانی سے ممکن ہے، عاشق مرحوم نے کہا میں فتوحات کا سکندرِ اعظم نہیں بننا چاہتا ہوں بلکہ فتوحات کے بعد کا سکندرِ اعظم بننا پسند کرتا ہوں، پھر کہنے لگے، تم آگئے ہو تو آج یہی مجلس منعقد ہوگی، گھر میں کلیجی پکی ہے خود کھاؤنگا تم کو بھی کھلاؤنگا میں سکندر

اعظم بنوں گا، اور تم میری مجلس کے عزیز ترین دوست، کلیجی آئی، وہ سکندر اعظم بنے، اور میں ان کی مجلس کا حاشیہ نشین،

اس وقت وہ پاکستان ریڈیو میں نیوز اڈیٹر تھے، ان کو محکمہ کی طرف سے ایک جیپ مل گئی تھی، ان کو اپنی زندگی کو رواں دواں اور رقصاں بنانے کے لئے یہ جیپ کافی تھی، وہ مجھکو اپنے ساتھ اسی پر بٹھاتے اور ڈھاکہ کی سڑکوں اور گلیوں میں اُڑے پھرتے، وہ اپنے بالائی افسروں سے صرف انتہائی ضرورت کے وقت ملتے، ورنہ اپنا فرض منصبی انجام دیکر سکندرِ اعظم بن جاتے، دوستوں کی مجلسیں ہوتیں، اور ان کے قہقہے اور چہچہے ہوتے، کبھی قائد اعظم کی تقریریں ان کی نوک زبان ہوتیں، کبھی نواب زادہ لیاقت علی خاں کبھی سر ناظم الدین، کبھی فضل حق، کبھی نور الامین، کبھی سردار عبد الرب نشتر کی دلچسپ گفتگوئیں نقل کرتے، پھر یکایک ابسن، مارلو، برناڈشا، جسٹر ٹن، غالب، اقبال، شبلیؔ، سید سلیمانؒ ندوی، جگر مرادآبادی کی تحریروں کے دل آویز ٹکڑے اور اشعار سنانے لگتے، پھر دیسنہ کے چماری، جولاہا، پگھرن دھوبی، چھتی پاسبان، سنیچر چمار، جو ساؤ تیلی، گوہر خاں براہل، گنڈوں کا سردار کسریا، شادی بیاہ میں بے تکان گالیاں بکنے والی انجر بادائی، دیسنہ مدرسہ کے لڑکوں کی مشترکہ معشوقہ سلمتی، پروفیسر عین الحق مرحوم اور قمر الدین خاں پر گفتگو آجاتی تو وہ اور بھی باغ و بہار بن جاتے، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ ان کی علمی و ادبی گفتگو زیادہ لذیذ ہوتی

یا پرانے وطن کی گلیوں کی یہ بھولی بسری باتیں، اس وقت تک ان کے والد، بہن، بہنوئی، اور بیوی کے تمام اعزہ ہندوستان ہی میں چھوٹ گئے تھے انکو یاد کر کے ان کے پاکستان آجانے کی خوشی میں افسردگی اور رنج کا پہلو ابھارتی لیکن اس وقت تک ان کے بہت سے اعزہ اور ہموطن ڈھاکہ پہونچ چکے تھے انکی ہر ممکن امداد سے ان کی افسردگی اور رنج کا پہلو جاتا رہتا، کسی کو مکان دلانے کسی کے لئے ملازمت بہم پہنچاتے اور کسی طالب علم کو کسی کالج میں داخل کرانے کی فکر میں لگے رہتے، اس فکر میں ان کو بڑی راحت ملتی،

پھر جب وہ پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام پر گفتگو کرتے تو وہ اپنے اصلی رنگ میں آجاتے، اور کہتے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کو ملک کی تقسیم سے بڑا دکھ ہے لیکن آخر یہ دکھ کیوں ہے؟ کیا اس لئے کہ ہندوستان کی جغرافیائی وحدت ختم ہوگئی، برما ہندوستان سے کٹا، سیلون علیحدہ ہوا تو کیا اسکی جغرافیائی وحدت قائم تھی؟ اور ہندوستان میں جغرافیائی وحدت یا تو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں یا برطانوی حکومت کے عہد میں قائم ہوئی، اکبر اعظم کی زندگی جنگ و جدل میں گذری لیکن وہ بھی ہندوستان کو ایک نہ کر سکا، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے تو یہاں ہر ضلع میں علیحدہ علیحدہ ایک حکومت تھی، ہر شہر کے قلعے اس کی شہادت دے رہے ہیں، مختلف راجے مہاراجے علیحدہ علیحدہ شہروں میں اپنی راجدھانی بنا کر اور قلعہ کے اندر بیٹھ کر حکومت کرتے لگتے، چندر گپت

Scanned by CamScanner

سمدر گپت، ہرش وردھن وغیرہ نے اپنی سلطنت کے دائرے ضرور بڑھائے لیکن ان کے بعد پھر ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اس سلسلہ میں عاشق مرحوم نے یاد دلایا کہ پاکستان کی تحریک زور پکڑ رہی تھی تو گاندھی جی کا ایک بیان شائع ہوا کہ وہ ملک کے بٹوارے کے بجائے یہ بات پسند کریں گے کہ انگریز ہندوستان کی پوری حکومت قائد اعظم محمد علی جناح کے حوالے کر کے چلے جائیں اس پر قائد اعظم کا یہ بیان شائع ہوا کہ انگریزوں نے ہم مسلمانوں سے ہندوستان کی حکومت لی تھی، اسلئے ہم یہ حکومت واپس لینے کے لئے تیار ہیں، اس بیان کو پڑھ کر بمبئی کے کے ایم منشی نے بیان دیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے ہندوستان کی حکومت لی، مسلمانوں کی حکومت تو شمالی ہند کے کچھ حصوں پر رہی، ورنہ جنوبی ہند میں وجیا نگر اور پانڈو وغیرہ کی حکومتیں ہمیشہ آزاد رہیں، اس بیان سے قائد اعظم نے فوراً فائدہ اٹھایا، اور پھر بیان دیا کہ ہم تو ہندوستان کے دو ہی ٹکڑے چاہتے ہیں، کے ایم منشی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان برابر مختلف ٹکڑوں میں منقسم رہا، پھر اس کی جغرافیائی وحدت کے لئے اصرار کیوں ہے ؟

عاشق مرحوم لارڈ ماونٹ بیٹن کے بڑے ناقد تھے، اور اس کو پاکستان کا بہت بڑا دشمن سمجھتے اور کہتے کہ وہ انگلستان کے شاہی خاندان کا فرد تھا، اس کو جاہ و جلال اور شان و شوکت بہت پسند تھی، وہ جب وائسرائے بن کر ہندوستان

آیا تو وائسریگل لاج میں اپنی حلف برداری کے موقع پر ایسے تزک و احتشام
کا جشن منوایا جو پہلے کسی اور وائسرائے کے لئے نہیں منعقد ہوا تھا، اس کی دلی
خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد بھی وہ کچھ دنوں کیلئے
دونوں جگہوں کا گورنر جنرل بنا رہے، تاکہ اس کی رخصتی بھی شاہانہ انداز پر ہو۔
لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی سحر آمیز مسکراہٹوں سے پنڈت جواہر لال نہرو کچھ اب
مسحور ہو گئے تھے کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل تسلیم کرنے کے لئے تیار
ہو گئے، لیکن جب وہ اور لیاقت علی خاں آخری بار وائسریگل لاج اپنے اپنے ملکوں
کے گورنر جنرل کے نام کی تجویز پیش کرنے کے لئے گئے تو پنڈت جواہر لال نہرو
کو آخر آخر وقت تک یقین رہا کہ ان کی طرح لیاقت علی خاں بھی پاکستان کے
لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کا نام پیش کریں گے، پنڈت جواہر لال نہرو نے سرکاری
کاغذ پر بڑی فراخدلی کے ساتھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا نام لکھ دیا، لیکن جب یہی
کاغذ لیاقت علی خاں کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے
بجائے قائد اعظم محمد علی جناح کا نام لکھ دیا، جس سے نہ صرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن
اور پنڈت جواہر لال نہرو، بلکہ انگلستان، ہندوستان اور پاکستان کے سب
ہی لوگ حیرت زدہ رہے، اس سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دل میں جو گرہ
پڑی وہ مختلف صورتوں میں ابھری، وہ اندرونی طور پر پاکستان کا دشمن ہو گیا
اس کے زمانہ میں دہلی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی جو خونریزی ہوئی

Scanned by CamScanner

ان میں اس کی پاکستان دشمنی بھی کارفرما تھی، یہ دشمنی ریڈکلف ایوارڈ میں اور
بھی زیادہ نمایاں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ ریڈکلف ایوارڈ کچھ اور تھا، لیکن لارڈ
ماؤنٹ بیٹن نے اس کو کچھ اور کر دیا، پٹھان کوٹ کو ہندوستان میں شامل کر کے
انھوں نے ہندوستان و پاکستان کے درمیان کشمیر کا مستقل جھگڑا کھڑا کر دیا اور
پھر یہاں تک افواہیں پھیل گئی تھیں کہ لاہور بھی ہندوستان ہی کو ملے گا، اگر لاہور
ہندوستان کو دیدیا جاتا تو پھر بڑی خونریزی ہوتی، پاکستان ضرور بنا لیکن کٹا پھٹا
اور کرم خوردہ بنا، جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پاکستان دشمنی کو بھی بڑا دخل ہے۔

وہ کہتے کہ پاکستان کی تحریک میں پنڈت جواہر لال نہرو کے بیانات کی وجہ
سے تین اہم موڑ آئے، پہلا تو وہ تھا جب انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری
میں یہ لکھا کہ اسلامی تمدن کی نشانی بظاہر یہ ہے کہ ایک خاص قسم کا پاجامہ جو
نہ زیادہ لانبا ہو اور نہ زیادہ اونچا، ایک خاص طریقے سے مونچھوں کی تراش
و خراش اور داڑھی کا رکھنا، اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی
ہوتی ہے،، اس کو پڑھ کر ہندوستان کے پورے مسلمان چیخ اٹھے، اور انھوں نے
اپنے اور ہندوؤں کے تمدن اور کلچر کا فرق اتنے پر زور طریقے پر بتایا کہ تمدن
اور کلچر سے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے سوچنے کا ذہن ہی بدل گیا، دوسرا
اہم موڑ وہ تھا جب پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کانگریس کی صدارت
کے زمانہ میں کانگریس کی غیر معمولی قوت اور مقبولیت ہو جانے کے غرور میں

ڈنکے کی چوٹ یہ بیان دیا کہ ہندوستان میں اب صرف دو ہی قوتیں ہیں
ایک برطانوی حکومت، اور دوسری کانگریس، قائد اعظم محمد علی نے فوراً ہی
جواب دیا، کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں صرف دو قوتیں ہیں ان دونوں
کے علاوہ مسلمانوں کی بھی تیسری قوت ہے، اور انھوں نے مسلم لیگ کی از سر نو
تنظیم کر کے اس تیسری قوت کا مظاہرہ بھی کر دکھایا، تیسرا اہم ترین موڑ وہ
تھا جب کہ سر اسٹیفورڈ کرپس نے اپنی تجویز میں ہندوستان کو Ferdera
ted units (وفاقی اکائیوں) میں تقسیم کیا، قائد اعظم محمد علی جناح
بہت ہی پس و پیش بلکہ پاکستان کے اور تخیل کو پس پشت ڈال کر اس
تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی
۱۰ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء کی ایک پریس کانفرنس میں یہ کہہ ڈالا کہ کانگریس نے اس
تجویز کو منظور تو کر لیا ہے لیکن وہ دستور ساز اسمبلی میں بالکل آزاد ہو کر داخل
ہو گی، اور اس کو حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی مرضی، موقع اور مصلحت کے مطابق
جو چاہے کرے، قائد اعظم بھلا اس کو کب منظور کر سکتے تھے اور انھوں نے کرپس
کی تجویز کو منظور کر کے رد کر دیا، جس کے بعد ہندوستان کی تاریخ ہی بدل گئی،
اور پاکستان وجود میں آ گیا،

اس کے بعد عاشق مرحوم نے کہا کہ پاکستان کی آخری لڑائی دہلی کے
مرکزی سکریٹریٹ کے کمروں میں لڑی گئی، اور وہیں جیتی گئی، وائسرائے کے

اگزیکیٹو کونسل میں کانگریس اور مسلم لیگ کی شمولیت ہوئی تو کانگریسیوں نے فائنس کو ایک غیر اہم محکمہ سمجھ کر مسلم لیگ کے لئے چھوڑ دیا، اور جب یہ محکمہ لیاقت علی خاں کے ہاتھ آگیا، تو پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ بالکل بے بس اور لاچار ہو گئے، یہ دونوں جو بھی اسکیم پیش کرتے، اُس کے لئے لیاقت علی خاں کی منظوری ضروری ہوتی، یہاں تک کہ سردار پٹیل جیسے مرد آہن کو، ایک چپراسی کا تقرر کرنے کے لئے بھی لیاقت علی خاں کے چشم و ابرو کو دیکھنا پڑتا، اسی کے بعد سردار ولبھ بھائی پٹیل کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ تقسیم ملک کے سوا اب کوئی اور چارہ نہیں،

عاشق مرحوم نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی تحریک کو ہندوستان کا پریس فرقہ وارانہ بتاتا رہا، فرقہ واریت تو ایک سیاسی اصطلاح ہے سیاست کی بساط پر اس کے شاطر اپنے مخالفوں کی چال کو رد کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے، لیکن جب سطحی جذبات کی لہریں دب جائینگی تو تاریخ و سیاست کے ماہرین کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ تحریک فرقہ وارانہ نہ تھی، بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے بہاؤ کا ایک لازمی نتیجہ تھی، ہندوستان میں مسلمان آئے تو قدم قدم پر اپنا خون بہا کر اس کو اپنا وطن بنایا، تخت طاؤس پر بیٹھ کر یہاں حکومت کی مختلف اوقات میں کابل سے راس کماری تک اپنی حکومت کا پرچم لہرایا، یہاں کے در و دیوار پر ان کی تہذیب اور تمدن کے آثار ہیں انھوں نے اپنی نا اہلی کا

یہ ثبوت ضرور دیا کہ کلائیو، وارن ہیسٹنگز، کیننگ، ولزلی اور ڈلہوزی کے سامنے اپنی غیرت، حمیت اور عزت کی سپر ڈال دی، مگر اب جب کہ ہندوستان کی غلامی ختم ہو رہی تھی، ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی سوچنا تھا کہ ہندوستان کے نئے ڈھانچہ میں انکی تہذیب، انکے کلچر، ان کے نظام زندگی، ان کے مذہبی نظر و فکر کی حیثیت کیا ہوگی، وہ اکثریت اور اقلیت کی بھول بھلیوں میں اپنے کو ضم کرنے کے بجائے سیاست میں باعزت مقام چاہتے تھے، یہ کہنا کہ قائد اعظم نے ان کو بیوقوف بنایا حقیقت کے روشن چاند پہ خاک ڈالنا ہے، آخر مولانا حسین احمد جیسے ولی صفت اور مقدس بزرگ اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے الہلال کے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی میں نئی روح کا صور پھونکنے والے آتش بیان مقرر اور سحر بیان انشاپرداز مسلمانوں کو کیوں بیوقوف نہیں بنا سکے، تاریخ یہ بتائیگی کہ قائد اعظم نے مسلمانوں کا غلط ذہن بنایا، یا مسلمانوں کے ذہن سے قائد اعظم نے فائدہ اٹھایا، قائد اعظم کا بس کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وہی کیا جو مسلمان چاہتے تھے، اگر وہ مسلمانوں کے ذہن کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے تو وہ پریوی کونسل لندن میں پریکٹس کر کے بڑی دولت جمع کرنے والے بیرسٹر بن کر انگلستان کے کسی قبرستان میں دفن ہو جاتے، بابائے قوم نہ بنتے، پاکستان کی تحریک کی تاریخ لکھنے والوں کو یہ تجزیہ کرنا ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کو کن مذہبی، معاشرتی، عمرانی، سیاسی اور ذہنی اذیتوں اور کلفتوں کے مدارج سے گذرنا پڑا، جن سے

Scanned by CamScanner

ان کا اپنی مذہبی اور سیاسی زندگی کے نشاۃ ثانیہ کا ایک خاص ذہن بنا، پاکستان کی تحریک دراصل حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد شہید بریلویؒ کی تعلیمات کے محافظوں، قطب مینار، تخت طاؤس، تاج محل اور لال قلعہ کے بنانے والوں، .... سرحد اور پنجاب کے دشمنوں اور بہادروں، بنگال کے بھرے لیکن اپنی عزت و ناموس پر جان دینے والے فدائیوں اور جانبازوں کی حیات نو کی تحریک تھی، کہا جاتا ہے کہ پاکستان قربانیوں کے بغیر انگریزوں کے صدقہ میں بنا لیکن اس سے بڑھکر اور کیا قربانیاں ہو سکتی ہیں کہ دس لاکھ مسلمان تقسیم کے بعد شہید ہوئے، نوے لاکھ بے گھر ہوئے، ابن خلدون یا ابن خلکان اور طبری کا قلم ہو تو ان قربانیوں کی ولولہ انگیز داستانیں لکھی جا سکتی ہیں، دنیا کی تاریخ میں یہ مثال نہیں، کہ اتنی قربانیوں کے بعد کوئی ملک بنا ہو بے شمار دولت ہندوستان میں چھوڑ دی گئی معصوم عورتوں کی عزت و عصمت خاک میں مل گئی، بڑے بڑے محلات اور مکانات نذر آتش ہوئے، تب جا کر پاکستان بنا، مسلمان اپنی بڑی سے بڑی جائداد بڑے سے بڑے مکانات چھوڑ کر پاکستان چلے آئے، کہ وہ یہاں آکر حیات نو پائیں گے، ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے ہیں، ان کو اب یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ وہ کہیں کے نہ رہے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت اب بھی خوش

Scanned by CamScanner

ہے، اور خوش رہیگی کہ ان کے بھائیوں کی اکثریت کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت مل گئی اور ان کی سیاسی، مذہبی، اور تمدنی حیثیت محفوظ ہو گئی ہندوستان کے مسلمانوں کے اس ایثار، اور قربانی کی بہت ہی ولولہ انگیز تاریخ لکھی جا سکتی ہے، مسلمانوں میں گبن یا ٹوئن بی جیسا کوئی مورخ پیدا ہو جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کے اس جذبۂ ایثار کی داستان کو اس طرح پیش کر سکتا ہے کہ خود مسلمان پڑھیں تو ان کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جائے، کہا جاتا ہے کہ جنگ یرموک میں زخمی سپاہی العطش العطش پکارتے، اور جب ان کے پاس پانی پہنچتا تو وہ کہتے کہ پہلے میرے ساتھی زخمی بھائی کو پلاؤ تو پھر میری خبر لو، جنگ یرموک ہی کا یہی نقشہ مسلمانوں نے پیش کیا کہ اپنی پیاسی پیاس بجھانے سے پہلے اپنے اور بھائیوں کی پیاس بجھائی۔

عاشق مرحوم اچھے مقرر تو تھے ہی، اپنی نجی مجلسوں میں بھی خطابت کا زور دکھا دیتے، ان کی یہ گفتگو دلچسپی سے سنی جا رہی تھی، اس لئے انھوں نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ پاکستان دراصل پاکستان کے رہنے والوں کی قربانیوں کے ساتھ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے ایثار سے بھی بنا، اگر وہ پاکستان کے حق میں ووٹ نہ دیتے تو سندھ، پنجاب، سرحد اور بنگال میں پاکستان نہیں بن سکتا تھا، پاکستانی مسلمانوں کو بھی اس کا احساس ہے، اور یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء سے اب تک مغربی اور مشرقی پاکستان میں لاکھوں مہاجرین

کی اور برابر جاری ہے، ان کو یہاں رہنے اور زندگی بسر کرنے کا ٹھکانا مل جاتا ہے، گو پاکستان کی معیشت پر اس کا بار ضرور پڑ رہا ہے، لیکن پاکستان کو یہ بار ہنسی خوشی برداشت کرنا ہے، مہاجر وغیر مہاجر، بنگالی وغیر بنگالی، پنجابی وغیر پنجابی، سندھی اور غیر سندھی کے جھگڑے ہوتے رہیں گے، ایسے جھگڑے ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتے رہتے ہیں، یہ ناگزیر ہیں، حکومت چلانے والوں کی اہلی اور نااہلی اسی میں دیکھی جاتی ہے کہ ان جھگڑوں کا ازالہ وہ کس طرح کرتے رہتے ہیں پاکستان کے مسلمانوں کی آزمائش کا اب وقت آیا ہے کہ اپنی نئی مملکت کو وہ رحمت خداوندی سمجھیں، نوے برس کی غلامی کے بعد ان کو پھر ایک مملکت کی حکومت ملی ہے، انھوں نے محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ کی طرح حکومت کی تو ان پر لعنت اور پھٹکار ہوگی اور اگر انھوں نے خالد بن ولیدؓ، ابو عبیدہؓ، عمرو بن العاصؓ، اور صلاح الدین ایوبی کی سپہگری، شہاب الدین غوری کی پامردی، بابر کا عزم، اکبر کا تدبر، شاہجہاں کی شان وشوکت، اورنگزیب عالمگیر کی دینداری اور بلند حوصلگی اور عمر بن عبد العزیزؒ کی پاک نفسی دکھائی تو ضرور ان پر رحمت خداوندی ہوگی۔

میں نے ان کو روکتے ہوئے کہا کہ تم تو کسی پلیٹ فارم کے مقرر بن رہے ہو، تم کو خبر نہیں کہ تم کہاں بیٹھے ہو، لیکن انھوں نے مجھکو روک کر اپنے جوش بیان کا سلسلہ قائم رکھا، اور مجھکو جھنجھوڑ کر کہا تم سلاطین دہلی اور مغل بادشاہوں کی تاریخ لکھنے میں لگے ہو، ان کو اب چھوڑو، ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی تاریخ لکھو،

گذشتہ تاریخ کی عظمت پر فخر نہ کرو، بلکہ یہ دکھاؤ کہ یہ قطب مینار مسلمان حکمرانوں
کی سیاسی غلطیوں اور فرو گذاشتوں کا مینار ہے، یہ تاج محل مسلمانوں کے اطوار
و کردار کا شاندار مقبرہ ہے، یہ لال قلعہ مسلمانوں کے اخلاق و سیرت کا عالیشان
کھنڈر ہے، کیونکہ یہ حکمراں سیاسی غلطیاں نہ کرتے، اطوار و کردار کا اعلیٰ نمونے
پیش کرنے میں لگے رہتے، تو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی،
میں نے پھر ان کو روکا کہ تمکو تو تقریر کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، ان
باتوں کو چھوڑو، دینہ کی تعریفیں بدا کے مزیدار قصے سناؤ، پھر یہی قصے شروع ہوگئے
میں ڈھاکہ میں ایک مہینہ رہا، اور جب وہاں سے روانہ ہوا تو محسوس کیا کہ عاشق
مرحوم کے ساتھ یہ ایک مہینہ زندگی کے اچھے ایام میں شمار کرتا رہونگا،

۱۹۵۳ء میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی پاکستان ہسٹاریکل
کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ ایک بہت
ناخوشگوار واقعہ پیش آیا، انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک جگہ فرمایا کہ ہندو
اقتدار کے زمانہ میں بنگلہ زبان ہندو تخیل اور ہندو دیومالا سے بھر گئی تھی، بعض لوگوں
نے اردو نہ جاننے والے طلبہ کو اس کا مطلب کچھ کا کچھ سمجھا دیا، جس سے طلبہ نے
غیظ و غضب میں آکر ایسی حرکتیں کیں جن کو سنجیدہ لوگوں نے سخت ناپسند کیا، عاشق
مرحوم ڈھاکہ ہی میں تھے، ان کو بڑا دکھ ہوا کہ ایک ایسی ذات کو جس سے کبھی کسی کو
ایذا نہیں پہونچی، اتنی بڑی تکلیف پہونچائی گئی، اس واقعہ کے بعد وہ سید صاحب.

ے ملنے گئے، تو ان کے ظرف و تحمل کا یہ حال تھا کہ انھوں نے طلبہ کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، عاشق مرحوم کا بیان ہے کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت مسیحؑ نے اس وقت کہے تھے، جب انکو تختہ دار پر چڑھایا جا رہا تھا، عاشق مرحوم نے بتایا کہ ان ہی لڑکوں نے ہنگامہ کیا تھا، جو سید صاحبؒ کی عظمت سے بے خبر اور ان کے خطبہ کی عالمانہ موشگافیوں کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھے، ان کو اس پر بڑا تعجب تھا کہ ایک مولوی ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کر رہا ہے، عاشق مرحوم نے اس واقعے سے متاثر ہو کر ڈھاکہ کے مشہور اخبار مارننگ نیوز میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا Who is Sulaman Nadvi "سید سلیمان ندویؒ کیا چیز ہیں"، اس کو پڑھ کر طلبہ کو بڑی ندامت ہوئی کہ ایسے عظیم المرتبت اہل علم اور انسانیت و شرافت کے پیکر کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ کس قدر نازیبا تھا،

اس کے چند مہینے کے بعد سید صاحبؒ کی وفات کراچی میں ہو گئی تو عاشق مرحوم نے ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر زین العابدین صاحب کی خواہش پر ایک تعزیتی تقریر نشر کر کے اپنی عقیدت و محبت کا خراج پیش کیا، پھر انگریزی میں کراچی کے مشہور روزنامہ ڈان میں ایک مضمون بھی لکھا،

میں ۱۹۵۵ء میں دار المصنفین کے ایک کام سے کراچی گیا، وہاں اس وقت عاشق مرحوم بھی تبدیل ہو کر آگئے تھے، اور پاکستان ریڈیو میں چیف نیوز ایڈیٹر کے

فرائض انجام دے رہے تھے، یہیں حضرت سید صاحبؒ کی بیگم صاحبہ اور ان کے بڑے داماد سید ابو عاصم صاحب کے ساتھ جہانگیر روڈ میں قیام پذیر ہوا، چار سال کے بعد عاشق مرحوم سے ملاقات ہوئی تو ان کے چہرے پر محبت و اخلاص کا سمندر امنڈ پڑا تھا، کہنے لگے، خوب آئے، ڈاکٹر شمیم کو بھی ڈھاکہ سے بلواتا ہوں، پھر ہم تینوں تھری مسکیٹرز (Three Musketeers) بنکر کراچی کی خاک چھانیں گے۔

دوسرے دن ہم دونوں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے، حضرت سید صاحب میرے لئے تو سب کچھ تھے، وہ نہ صرف میرے محترم بزرگ، شفیق استاد رہبر اور پیشوا تھے، بلکہ میری نظر میں ان سے بڑھ کر کوئی پاکیزہ انسان اور بلند صاحب علم نہیں گذرا، میں جب ان کے مزار پر حاضر ہوا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، جی چاہا کہ قبر سے لپٹ لپٹ کر روؤں، بلکہ قبر پھاڑ کر ایک بار ان کے حسین چہرے، منور داڑھی، لطیف جسم، محبت بھری آنکھوں اور مسکراتے ہوئے لبوں کی زیارت کر کے اپنی جنت نگاہ میں پھر ایک بار آباد ہو جاؤں، ان کی قبر دیکھ کر عجیب کیفیت طاری تھی کہ آہ! علم کی موشگافی، فن کی باریک بینی، تحقیق کی ژرف نگاہی اور قلم کی نکتہ آفرینی، یہ سب چیزیں آج مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہیں، دل کہہ رہا تھا کہ دار المصنفین کو انھوں نے علم و فن کا ایک تاج محل بنا دیا تھا، اب وہ چودھویں رات کی چاندنی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا، ان کے شاگرد

وہاں ضرور ہیں، لیکن وہ ان کے بغیر وہاں علمی یتیم اسیر بن کر زندگی گذار رہے ہیں،
معلوم نہیں کیا کیا خیالات آئے، بمشکل سے فاتحہ پڑھی،

عاشق مرحوم بھی ساکت وصامت کھڑے تھے، جب مجھکو کچھ سکون
ہوا، تو وہ گویا ہوئے کہ ڈاکٹر اقبال نے سید صاحبؒ کے متعلق جو یہ کہا تھا کہ وہ
جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد ہیں، تو بالکل صحیح ہے، انھوں نے سیرۃ النبیؐ میں ہمارے
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور شریعت کی کوہ کنی جس باوقار انداز میں
کی ہے، اس کی مثال کسی زبان میں نہیں مل سکتی، چودہ سو (١٤٠٠) سال سے ہمارے
رسول کی سیرت لکھی جارہی تھی، لیکن جس انداز میں سیرۃ النبیؐ لکھی گئی ہے، اس سے مسلمانوں
کو ایک بار پھر تازہ دم اور تیز قدم ہونے کا موقع مل گیا ہے، وہ کہنے لگے کہ اسلام
کو علماء تو اچھی طرح سمجھتے تھے، لیکن وہ ہندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں
کو سمجھا نہ سکے تھے، یہ سید صاحبؒ ہی ہیں، جو اسلام کے خدوخال کو ان کے
سامنے پورے طور پر لے آئے، ڈاکٹر اقبال کا یہ کہہ دینا کہ وہ جوئے شیر اسلامیہ کے
فرہاد ہیں، معمولی بات نہیں، اس سے یہ ظاہر ہے، کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان
حضرت سید صاحبؒ کی علمی اور اسلامی بصیرت پر پورا ایمان لے آیا تھا، انگریزی
تعلیم یافتہ طبقہ بڑا ہی بر خود غلط ہوتا ہے، اسکی علمی سیری اور ذہنی آسودگی
بڑی مشکل سے ہوتی ہے، لیکن سید صاحبؒ نے اس طبقہ کو اپنی طرف مائل
کرکے چھوڑا، اور ان کو اسلامی تعلیمات کا ساغر پلا کر مست کر دیا، کوئی بھی

Scanned by CamScanner

پڑھا لکھا مسلمان خطبات مدراس کو پڑھے گا تو وہ بے پیے جھومتا رہے گا، اسکی
ہر سطر میں ادب و انشا کی گل کاری اور جادو بیانی بھی ہے، اور توحید و رسالت
کی چھلکتی ہوئی شراب ارغوانی بھی، اس کے انداز بیان میں انشا پردازانہ
رنگ کے ساتھ عالمانہ نہیں بلکہ معلمانہ رنگ ہے، وہ اس میں مصنف کے قلم
کا زور نہیں دکھانا چاہتے ہیں، بلکہ اپنے رسول کی تعلیمات کی اصلی روح دکھا کر ہمکو
کچھ سیکھنے اور درس حاصل کرنے کو بھی کہتے ہیں، پھر کہنے لگے کہ سید صاحب کی تحریروں
اور کتابوں کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ جس چیز پر لکھتے اس پر حاوی رہتے،
وہ موضوع کے قابو میں نہ ہوتے بلکہ موضوع ان کے قابو میں ہوتا، وہ جس طرح
چاہتے اس کی باگ موڑ دیتے، موضوع ان کے ہاتھ میں موم بن جاتا، اور وہ اس
کی شکل اپنی خواہش کے مطابق بناتے رہتے، یہ ان کے کثرت مطالعہ کا نتیجہ تھا،
انھوں نے عرب و ہند کے تعلقات اور خیام میں جو داد تحقیق دی ہے، اسکے سامنے
بڑے بڑے ارباب تحقیق کو جھکنا پڑیگا، ان دونوں کتابوں میں تحقیق کے جواہرات
چمکتے دمکتے نظر آتے ہیں، تاریخ ادب اردو کے مورخ کو جہاں یہ لکھنا پڑیگا کہ سر سید
نے اردو میں نثر نگاری کی ابتدا کی، حالی نے سر سید کی سادگی کے کھردراپن کو
اپنے خاص انداز بیان سے دور کیا، آزاد نے اس میں رنگینی اور رسیلا پن پیدا
کیا، نذیر احمد نے برجستگی اور روانی دی، شبلی نے لطافت اور نزاکت عطا کی
ابو الکلام نے اسکو شوکت و جلالت بخشی، وہاں اسکو یہ بھی تحریر کرنا پڑیگا کہ

سید سلیمان ندویؒ نے اس کو وزن اور وقار سے مالا مال کیا، اُن کی تحریروں میں انشاپردازانہ قوت اور عالمانہ بصیرت کی گنگا جمنی بہتی نظر آتی ہے،

عاشق مرحوم نے یہ باتیں کرتے کرتے میرے بازو کو پکڑ کر جھنجھوڑا اور کہا کہ تم اپنے کو خوش قسمت سمجھو کہ تم کو وہاں رہنے کا موقع مل گیا، جہاں سید صاحبؒ کی علمی، ادبی اور تحقیقی بصیرت کا سمندر بہا تھا، ان کی ان باتوں کو سن کر مزار کی حاضری سے غم و الم کی جو کیفیت طاری ہو گئی تھی، جاتی رہی، وہ حضرت سید صاحبؒ کے بڑے معتقد تھے، اس لئے ان کے متعلق دیر تک باتیں کرتے رہے، کہنے لگے کہ حسین شہید سہروردی نے سید صاحبؒ کی وفات پر کہا تھا کہ سید صاحبؒ ابن تیمیہ کے پائے کے عالم تھے، آخر میں بڑے غمناک لہجہ میں اس وقت کے سفیر شام شیخ ابو الخیر کے یہ جملے دہرائے کہ ہم کو علامہ سید سلیمان ندویؒ کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا دکھ ہے کہ جو علوم و فنون ان کے سینے میں تھے، وہ بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئے، یہ سنکر میری آنکھیں نم ہو گئیں،

راستے ہی میں عاشق مرحوم نے سنجیدہ گفتگو ختم کر کے تفریحی باتیں شروع کر دیں تو سید صاحبؒ کے کچھ لطیفے بھی سنائے، کہنے لگے کہ جب وہ دیسنہ آتے تو علامگی کو اعظم گڈھ ہی میں چھوڑ کر آتے، یہاں اگر کوئی ان کو مولانا یا علامہ کہتا تو وہ خفا ہوتے، دیسنہ میں وہ یا سلیمان تھے، یا سلو تھے، یا سلیمان چچا یا سلیمان بھائی، وہ دیسنہ کے تمام لوگوں سے بڑی محبت اور بے تکلفی سے ملتے، وہ دیسنہ کی بوڑھی خاتون

شریفن بی بی کو پھوپھی کہتے تھے اگرچہ وہ ماما تھیں، ایک دفعہ جب وہ ان سے ملنے گئے تو شریفن بوا نے ان سے پوچھا بیٹا کتنی تنخواہ ملتی ہے، سید صاحبؒ نے بتایا تو پھر پوچھا "اور اوپر کی آمدنی"؟ سید صاحبؒ ہنس پڑے، یہ وہ زمانہ تھا جب اصلی آمدنی تنخواہ کی نہیں بلکہ وہ سمجھی جاتی تھی جو غیب سے آتی تھی،

عاشق مرحوم نے بیان کیا کہ سید صاحبؒ دیسنہ میں ایک مجلس میں اشعار سنا رہے تھے، اپنے بچپن کے ایک دوست کو مخاطب کرکے کہا سنیئے ایک شعر یہ خاص آپ کے لئے ہے،

دستِ گستاخ کو اجازت دو   ہائے مطلب کہا نہیں جاتا

دیسنہ میں سید نجیب اشرف ندوی صاحب (سابق رفیق دار المصنفین پھر استاد اسمٰعیل کالج بمبئی) کی شادی کے موقع پر صوبہ بہار کے کچھ شعراء جمع ہو گئے تھے، سید صاحبؒ نے ان کے ترنم کو سُن کر کہا پہلے زمانہ میں شادی بیاہ کے موقع پر بھانڈ جمع کئے جاتے تھے، اس تقریب میں شعراء آئے ہیں، اس موقع پر فرمایا کہ بزرگوں نے شادی کی رسموں کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بار بار شادی کی جائے

جس زمانہ میں سید صاحبؒ کی دوسری بیوی کا انتقال ہوا اسی زمانہ میں ان کے ہموطن ڈاکٹر احمد کریم عرف حسا (سول سرجن) کی اہلیہ نے بھی وفات پائی تھی، سید صاحبؒ نے ایک موقع پر ان سے فرمایا، "حسا بھائی"، ہم دونوں اب

بڈی ڈاکٹر سے بیاہ کرلیں تاکہ وہ اپنا علاج خود کرسکے، ہم لوگوں کو پریشانی اٹھانی نہ پڑے،

دیسنہ کے ایک بزرگ ندوہ سے فارغ التحصیل تھے، لیکن انگریزی تعلیم پاکر ایک کالج میں عربی فارسی اور اردو کے پروفیسر ہو گئے تھے، داڑھی ایسی رکھنے لگے تھے کہ نہ شرعی تھی، اور نہ استرے سے مونڈی ہوئی معلوم ہوتی سید صاحبؒ اس داڑھی کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ داڑھی کی قبر ہے،

عاشق مرحوم نے یہ بھی بیان کیا کہ جب سید صاحبؒ پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ آئے تو ان کے ایک دوست مولانا دین محمد ندوی ان سے ملنے آئے، ان کو دیکھ کر سید صاحبؒ نے فرمایا، آئیے آئیے پاکستان تو آپ ہی کے لئے بنا ہے، مولانا دین محمد سن کر حیران ہوئے کہ اس کا کیا مطلب ہے، سید صاحبؒ نے ان کی پریشانی دیکھ کر فرمایا، دین محمد یعنی اسلام کے لئے بنا،

سید صاحبؒ جمعیۃ العلماء مشرقی پاکستان کی صدارت کے لئے ڈھاکہ پہونچے، تو ایک صاحب ان سے ملنے آئے، جو بنگلہ زبان اور بنگلہ رسم الخط کے بڑے حامی اور اردو کے بڑے مخالف تھے، انھوں نے سید صاحب سے کہا مولانا! عربی کو قومی زبان بنایا جائے، سید صاحبؒ نے جواب دیا جب آپ کو عربی رسم الخط تک گوارا نہیں تو پھر عربی کو کیسے چاہتے ہیں،

عاشق مرحوم کی زبانی یہ لطیفہ سن کر میں نے ان سے کہا کہ وہ یہ تمام

باتیں ایک مضمون میں قلمبند کر لو، چنانچہ انھوں نے ایک مضمون لکھا جو بعد میں ستمبر ۱۹۵۷ء کے معارف میں بھی شائع ہوا، اس میں انھوں نے جہاں اور باتیں لکھیں وہاں یہ بھی لکھا :-

"جب وہ یعنی سید صاحبؒ دیسنہ تشریف لاتے تھے تو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان کو اسی طرح دیکھتا تھا جس طرح اپنے نصاب میں سقراط ارسطو اور افلاطون کی تصویریں دیکھا کرتا تھا، اور ہم لوگ فخر غرور اور پندار کے نشے سے سرشار ہو جاتے، تھے کہ وہ ہمارے ہموطن بھی ہیں اور بزرگ بھی"۔

سید صاحبؒ کے متعلق انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ایک انگریزی محاورہ کے مطابق انکا علم ان کے کاندھوں پر سبک نشین تھا، میرا قیام کراچی میں تقریباً ڈھائی مہینہ رہا، اسی اثنا میں ڈاکٹر محمد شمیم بھی آگئے ہم دونوں کی دعوت پر کراچی آگئے، پھر تو ہم تینوں واقعی تھری مسکیٹرز بنے ہوئے تھے، عاشق مرحوم جہاں بھی ہوتے اپنی باتوں سے ایسی فضا پیدا کر دیتے کہ معلوم ہوتا کہ ہم ساون کے مہینے میں کوئل کی کوک سن سن کر جھولے جھول رہے ہیں، ہم لوگ کلفٹن پر ہوتے تو وہ کہتے کہ یہاں حسن و شباب کے ساغر ڈھلتے ہیں، یہاں بجلی حسن یار دکھائی دیتی ہے، یہاں صبح بنارس کے ساتھ شام اودھ بھی دیکھی جا سکتی ہے، یہاں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کی زبان پر ہوگا، دریا دریا روتا ہوں، صحرا صحرا وحشت ہے، اور ایسے بھی جو تماشائے گل و صنوبر دیکھنے کے لئے آتے ہیں، یہاں کوئی نقش حرماں بنا ہوا ہوتا

ہے تو کوئی مجسمِ حیرت بنا ہوا دکھائی دیتا ہے، وہ ہم لوگوں کو کسی رستوران میں لے جاتے اور کہتے کہ اگر تم لوگ شراب زندگی سے مخمور نہیں ہوتے تو شربت زندگی پی کر مسرور ہو جاؤ، کراچی میں مٹھائیوں کی بڑی خوبصورت دکانیں ہیں، وہ ایسی کسی دکان کی زیبائش اور آرائش کو دیکھتے تھے تو وہاں ہم لوگوں کو زبردستی لے جاتے اور کہتے کہ چلو یہاں بیٹھ کر زندگی کی مٹھاس حاصل کریں، زندگی کا رس پئیں،

میں اس زمانہ میں کئی کتابوں اشرف علی فغاں، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ اور بزم مملوکیہ کا مصنف بن چکا تھا، معارف میں میرا نام شریکِ مرتب کی حیثیت سے چھپنے لگا تھا، عاشق مرحوم اپنے ملنے والوں سے میرا تعارف کراتے، اگر وہ میری کتابوں سے واقف ہوتے تو وہ ان سے خوش ہو جاتے، اور اگر وہ ان سے عدم واقفیت کا اظہار کرتے، تو وہ زبان حال سے کہتے نظر آتے کہ یہ کیسے بے خبر بلکہ ناکارہ لوگ ہیں جو دارالمصنفین اور اسکی مطبوعات سے واقف نہیں ہیں، یہ دارالمصنفین اور میری ذات سے ان کی محبت کی دلیل تھی،

دارالمصنفین کے کام کے سلسلہ میں مجھکو اس زمانے کے گورنر جنرل کے سکریٹری جناب قدرت اللہ شہاب، آئی. سی. ایس، جناب ممتاز احمد صاحب سکریٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ، جناب محمد مظفر حسن ملک صاحب ڈپٹی سکریٹری فنانس

ڈیپارٹمنٹ، جناب نیاز احمد صاحب آئی۔سی۔ایس (جن کو اب مرحوم لکھنا پڑتا ہے) چیف سکریٹری حکومت سندھ، اور دوسرے افسروں سے بھی ملنا پڑتا
عاشق مرحوم اکثر و بیشتر ساتھ ہوتے، اور میری مشکلیں حل کرتے رہتے، بالآخر میرا کام ہو گیا، جو یہ تھا کہ دار المصنفین کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ پاکستان میں درآمد ہوتی رہیں،

عاشق مرحوم اس زمانہ میں اقبالؔ کا مطالعہ بہت شوق سے کر رہے تھے، ان پر کئی کتابیں جمع کر رکھی تھیں، یوں تو ان کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان کے پاس اقبالؔ کے کلام کے تمام مجموعے تھے، لیکن اب اقبالؔ کے مطالعہ میں ان کی نظر میں بڑی رنگا رنگی پیدا ہو گئی تھی، ایک روز ہم چند بے تکلف احباب جمع تھے کہ اقبال کا ذکر آگیا، پھر تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کے لئے ایک اچھا موضوع ہاتھ آگیا ہے، کہنے لگے کہ اقبال مسلمانوں کو شاہین کا کیریکٹر دے گئے ہیں، اپنے فلسفۂ خودی سے انسان کی جلوتوں میں مصطفائی اور اسکی خلوتوں میں کبریائی عطا کر گئے ہیں! انسان کی یزداں گیر خودی کو خدا سے ٹکرا گئے، انسان کی تقدیر کو تقدیر یزداں بنا گئے، یہ بادل، یہ گھٹائیں، یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں، یہ کوہ، یہ صحرا یہ سمندر اور یہ ہوائیں سب انسان کے تصرف میں کر گئے، کبھی دریا میں مثل موج ابھرنا، کبھی دریا کے سینے میں اترنا اور کبھی دریا کے ساحل سے گذرنا، سکھا گئے، نگاہ مرد مومن، عقابی پرواز، رمز مسلمانی، فقر سلمانی، آئینِ جواں مرداں، نالۂ نیم شبی،

فغان صبح گاہی، آداب خود آگاہی، گفتار دلبرانہ، کردار ماہرانہ اور جذب قلندرانہ کا درس دے گئے، اقبال کہہ گئے ہیں کہ مسلمان ایک ایسا پتھر ہے، کہ جس پر گرتا ہے اسے پاش پاش کر دیتا ہے، اور جو اس پر گرتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے، مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ مسلمان واقعی مسلمان ہو، اگر اقبال کی تعلیمات پر مسلمان عمل کریں تو مسلمان وہ طوفان بن سکتے ہیں جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں، اور وہ شبنم بھی بن سکتے ہیں، جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو،

میں نے عاشق مرحوم کے سلسلۂ کلام کو روکتے ہوئے کہا کہ تم مجھکو اپنا پرانا شاگرد سمجھ کر پھر درس و تدریس پر اتر آئے، ان کا سلسلۂ کلام ضرور ٹوٹ گیا لیکن وہ اقبال ہی کو موضوع بنائے رہے، کہنے لگے، کہ اقبال کو خدا سے عشق تھا، ایک بار ایک صاحب ان سے ان کے گھر پر ملنے آئے تو ان سے پوچھا کہ آپ نے جتنی کتابیں اب تک پڑھی ہیں، اُن میں سب سے بلند پایہ اور حکیمانہ کس کو پایا، اس کا جواب دینے سے پہلے وہ اپنے گھر کے اندر گئے، واپس ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جس کو ان صاحب کے ہاتھ میں دیکر کہا،، اس کو،، ان صاحب نے کتاب کو کھول کر دیکھا تو یہ قرآن مجید تھا، عاشق مرحوم نے اس کے بعد کہا کہ ڈاکٹر اقبال کلام مجید پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان پر کلام الٰہی نازل ہو رہا ہے، اور اتنا روتے کہ کلام پاک کے اوراق ان کے آنسو دل سے تر ہو جاتے، وہ فلسفی ہونے کے باوجود خدا پر ایمان بالغیب رکھتے تھے،

Scanned by CamScanner

عاشق مرحوم نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری میں زمان و مکان کی بڑی بحث ہے، فرانسیسی فلسفی برگسان کے فلسفہ میں بھی زمان کی دقیق بحثیں ملتی ہیں، ڈاکٹر اقبالؔ پیرس میں برگسان سے ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی یہ حدیث سنائی کہ زمانہ کو برا مت کہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں خود زمانہ ہوں، یہ سن کر برگسان کو بڑا تعجب ہوا، وہ بار بار ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرتا رہا کہ کیا یہ صحیح قول ہے۔

عاشق مرحوم کی گفتگو جاری تھی، انھوں نے کہا کہ اقبالؔ کے یہاں عشق خدا کے ساتھ عشق رسول بھی بہت زیادہ تھا، ایک بار ان سے کسی نے پوچھا کہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ احد کی پہاڑی پر کھڑے تھے، تو یہ پہاڑی لرزنے لگی، تو کیا پہاڑی کا لرزنا کوئی استعارہ ہے، یا امر واقعہ؟ ڈاکٹر اقبالؔ نے جواب دیا کہ تم نبوت، صدیقیت اور شہادت کے رتبہ سے ناواقف ہو، اسی لئے یہ سوال کرتے ہو، ورنہ نبوت سے پہاڑی کیا پوری کائنات میں لرزہ آسکتا ہے، یہ کہہ کر رونے لگے، عاشق مرحوم نے اسی سلسلہ میں یہ کہا کہ ڈاکٹر اقبالؔ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی ان کے سامنے یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے بھی میلے ہو جایا کرتے تھے۔

عاشق مرحوم نے کہا کہ ڈاکٹر اقبال سے کسی نے کہا کہ میں نے پڑھا ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو آس پاس کے

دار المصنفین شبلی ... اعظم گڈھ

رخت تعظیم سے جھک جاتے تھے، کیا واقعی ایسا ہوتا تھا، ڈاکٹر صاحب اس سوال سے عشق رسولؐ میں مست ہو گئے، اور کیا خوب فرمایا کہ اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کا عشق رسول ظاہر ہوتا ہے، گویا ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ درخت جھک رہے ہیں، اس کا درختوں کے جھکنے سے کوئی تعلق نہیں، اگر کسی کو حضرت عمرؓ کی آنکھیں نصیب ہوں تو وہ درخت کیا ساری دنیا کو رسول (صلعم) کے سامنے جھکی دیکھ سکتا ہے،

ہم میں سے کسی نے عاشق مرحوم سے کہا کہ اچھا ڈاکٹر اقبال کے اب کچھ لطائف وظرائف سناؤ، ان کے یہاں ان کی بھی کمی نہ تھی، ان کی گلفشانی جاری ہوئی تو کہنے لگے کہ اقبال یورپ کے سفر میں تھے تو ریل کے ایک سفر میں کسی یورپین مسافر سے گفتگو شروع ہو گئی، وہ مسافر بھی پڑھا لکھا تھا، اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ خدا نے پیغمبروں کو صرف ایشیا ہی میں بھیجا، یورپ میں کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا، ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یورپ کو شیطان کے لئے مخصوص رکھا، اور یہاں شیطان بھیجا، اس نے تعجب سے کہا شیطان؟ پھر پوچھا وہ شیطان کون سا ہے؟ ڈاکٹر اقبال نے کہا وہ شیطان اٹلی میں بھیجا گیا، اس کا نام میکاولی ہے، اس کی سیاست کی تعلیم کی اساس شیطنت پر ہے، جس کی تقلید پورے یورپ والے کر رہے ہیں،

پھر عاشق مرحوم نے کہا کہ لکھنؤ کے شیخ محمد حبیب اللہ صاحب ندوے

علی بہادر حبیب اللہ آٹھ سال کی عمر میں لندن گئے، وہاں سے پندرہ سال کے بعد ہندوستان آئے، تو مسلم لیگ کے لیڈر بن گئے، ڈاکٹر اقبال سے لاہور میں ملے، تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا میں تو آٹھ سال کی عمر سے انگلستان میں رہا، یہ سُن کر ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا، پھر تو آپ کو یہ کہنا چاہئے، ع

میموں کے سایہ میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں

عاشق مرحوم کا زور بیان جاری تھا، کہنے لگے کہ لاہور میں ایک بار الیکشن کی مہم جاری تھی، کچھ من چلے کارکنوں نے یہ مصرع موزوں کیا ع

ووٹ حاضر ہے اگر جائے کی پیالی مل جائے

ڈاکٹر اقبال کے سامنے یہ مصرع پڑھا گیا تو لاہور میں اس زمانہ کی ایک مشہور طوائف بالی تھی، ڈاکٹر صاحب نے قافیہ سے فائدہ اٹھا کر فوراً یہ کہا،

چلبلی شوخ طرحدار نرالی مل جائے،

نوجواں مرتے ہیں جب یہ مری بالی مل جائے

عاشق مرحوم نے کہا کہ ڈاکٹر اقبال طوائفوں کو وطن کی بہنیں کہا کرتے تھے، انھوں نے ایک اور لطیفہ سنایا کہ ایک بار ڈاکٹر اقبال گھر پر بیٹھے بانسری بجا رہے تھے، ان کے ایک سکھ دوست ان سے ملنے آئے تو ان کو بانسری بجاتے دیکھ کر کہا بانسری سے کب تک صحبت کرتے رہو گے، ڈاکٹر اقبال نے برجستہ جواب دیا، سکھنی جو ہوئی،

اب مجلس میں سکھوں کا ذکر آگیا، تو عاشق مرحوم کی بذلہ سنجی اور ظرافت کا فوارہ ابل پڑا، انھوں نے پہلو بدل کر کہا ان بے چاروں کی بھی عجیب و غریب شہرت ہو گئی ہے، خدا جانے کتنے لطیفے ان کی طرف منسوب ہیں، ایک بعد ان کی زبان چلی تو چلتی گئی، کہنے لگے کہ لارڈ لن لتھگو جب ہندوستان کے وائسرائے تھے تو ان کی اکزیکیٹو کونسل میں ایک مشہور سکھ لیڈر بھی تھے، وہ شملہ میں اپنی موٹر پر جا رہے تھے، تو یکایک موٹر رک گئی، ڈرائیور اتر گیا، سردار جی نے پوچھا کیا بات ہے، ڈرائیور نے کہا موٹر میں پٹرول نہیں ہے، سردار جی نے فوراً کہا کوئی مضائقہ نہیں موٹر موڑ کر واپس لے چلو، ڈرائیور ہنس پڑا، تو سردار جی کو خیال ہوا کہ جب پٹرول ہی نہیں تو موٹر واپس کیسے جا سکتی ہے،

کہنے لگے لارڈ ماونٹ بیٹن کے زمانہ میں ایک دوسرے سردار جی اکزیکیٹو کونسل کے ممبر ہوئے، شملہ میں ایک صاحب رات کو ان کے گھر ملنے گئے تو سخت بارش اور برف باری ہونے لگی، صاحب خانہ نے ان سے کہا اب رات کو یہیں آرام سے سو رہیں، سردار جی نے کہا بہت اچھا کچھ دیر کے لئے غائب ہو گئے، اور جب صاحب خانہ سے ملے تو بولے کہ میرے پاس شب خوابی کا لباس نہیں تھا میں کیسے سو سکتا تھا، اپنے بنگلہ سے جا کر لے آیا ہوں، اب آرام سے سوؤنگا،

کہنے لگے کہ دوسری جنگ عظیم میں ریزگاری کی بڑی دقت تھی، ایک روز ایک سردار جی ایک ڈاکخانہ میں سو روپے کی ریزگاریاں لیکر داخل ہوئے اور

پوسٹل کلرک سے کہا بابو جی یہ ریزگاریاں منی آرڈر کر رہا ہوں، آپ یہ لے لیں
عاشق مرحوم ترنگ پر تھے، اس لیے پھر کہا، ایک جلسہ میں ایک سردار جی تقریر کرنے لگے، تو سامعین کو اس سے دلچسپی نہیں ہوئی، وہ ایک ایک کرکے اٹھ گئے، صرف ایک سردار جی بیٹھے رہے، مقرر سردار نے ان سے کہا بھائی سب چلے گئے تو تم کیوں بیٹھے ہو، وہ بولے ابھی تمھاری تقریر کے بعد پروگرام کے مطابق مجھ کو بھی تقریر کرنی ہے،

عاشق مرحوم قہقہوں اور چہچہوں میں پھر گویا ہوئے کہ ایک سردار جی بس اسٹینڈ پر دیر سے کھڑے تھے بس آئی تو ان کو اس پر جگہ نہ ملی، لیکن بس چلی تو وہ اس کے پیچھے دوڑتے چلے یہاں تک اپنے گھر پہونچ گئے، بیوی سے خوش ہو کر بولے دیکھو! آج ہم بس کے پیچھے دوڑتے چلے آئے، تو چار آنے پیسے بچ گئے، بیوی آزردہ ہو کر بولیں تو پھر کیا کمائی کی، اگر کسی ٹیکسی کے پیچھے دوڑتے آتے تو دو روپیہ بچتے،

میں کراچی میں تھا تو اس وقت پاکستان کو بنے ہوئے آٹھ سال ہو گئے تھے، یہ مملکت چل نکلی تھی، پھر بھی اس کی سیاسی حالت قابلِ اطمینان نہ تھی، لیکن جب اس پر گفتگو آئی تو عاشق مرحوم بڑے فخر سے بیان کرتے کہ پاکستان کی حکومت بڑی بے سروسامانی میں تو قائم ہوئی لیکن اب کیا سے کیا ہو گئی ہے، وہ کراچی کے مختلف کالونیوں کی ازسرنو آبادی، بستیوں اور جھگیوں کی کوششوں سے متعدد ملوں اور فیکٹریوں کے قیام، انگریزی اور اردو اخبارات کی اشاعت کی کثرت، حتیٰ کہ کرکٹ کے کھلاڑیوں میں حفیظ

Scanned by CamScanner

کردار، حنیف محمد، فضل محمود اور وقار کی شاندار کامیابیوں کا ذکر بڑے طمطراق سے کرتے، اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد تھے، جو لقوے کے مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود آمر بنے ہوئے تھے، اسی کے ساتھ دستور ساز اسمبلی کے ممبران پارٹی بندی، بدعہدی، وعدہ شکنی، ضمیر فروشی اور کردار کی پستی کے جو نمونے پیش کر رہے تھے، اس سے وہاں کے عوام بہت بد دل تھے، آئے دن وزارتیں بدلتی رہتی تھیں، آٹھ سال ہو گئے تھے، لیکن پاکستان اپنا کوئی دستور نہ بنا سکا تھا، حالانکہ ہندوستان میں چھ مہینے کے اندر اس کا دستور بن گیا تھا، عاشق مرحوم کی توجہ ان کی طرف دلائی جاتی، تو اپنی زور بیانی اور گل فشانی کے باوجود اطمینان بخش دلائل دیکر اپنے مخاطبین کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے پھر بھی کہتے:

پاکستان کا وجود ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ایک بڑا امتحان ہے، ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے کو قربان کر کے پاکستان بنوایا، اب یہ پاکستانی مسلمانوں کی آزمائش ہے کہ اس کو نہ صرف برقرار بلکہ خوش حال اور مستحکم بنا کر رکھیں، ان کو ہندوستان کی اپنی گذشتہ تاریخ سے سبق لینا چاہئے، مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں بڑی کٹھن منزلیں طے کرنے کے بعد قائم ہوئی تھی، لیکن ان کے باہمی اختلاف نے ان کو کہیں کا نہ رکھا، غلاموں کو خلجیوں، تغلقوں کو سیدوں، سیدوں کو لودیوں اور لودیوں کو مغلوں نے بے دخل کر دیا، مغلوں کے زمانے میں، افغانوں نے ان کو ہر موقع پر ملک بدر کرنے

Scanned by CamScanner

کی کوشش کی، خود مغل شہزادوں میں تخت نشینی کے لیے خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں،
پھر ایرانی، تورانی، ہندوستانی، شیعہ، سنی امراء کی باہمی کشمکش اتنی بڑھی، کہ
ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت ملیامیٹ ہو کر رہ گئی، اگر
مسلمانوں میں باہمی اتحاد، یگانگت، موانست، فراخدلی اور رواداری ہوتی
تو آج بھی پورا ہندوستان انکے زیرنگیں رہتا، پاکستان کے مسلمانوں میں پھر وہی
پھوٹ، نفاق، اختلاف، آویزش اور کشمکش رہی تو پاکستان کا وہی حشر ہوگا، جو
اورنگزیب کی چھوڑی ہوئی سلطنت کا ہوا، اور پاکستان ڈوبا
تو پھر پاکستانی مسلمان بحر عرب اور بحر بنگال میں غرقاب ہوتے نظر آئیں گے
جس کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی دنیا بھی ان کے لیے وبال جان ہو جائے گی
لیکن اس مایوسانہ گفتگو کے بعد وہ یہ بھی کہتے کہ بقول لیاقت علی خاں مسلمانوں کے
اعمال تو ایسے نہ تھے کہ وہ پاکستان جیسی بڑی دولت سے نوازے جاتے، یہ ملک فضل
خداوندی سے بنا ہے تو رحمت الٰہی سے برقرار بھی رہے گا، پھر کہتے کہ سید صاحبؒ
برابر فرماتے کہ اسلامی تاریخ میں خواص تو اچھے نہیں رہے، لیکن عوام ہمیشہ
اچھے ثابت ہوئے، خواص اپنے ذاتی اغراض اور مفاد کی خاطر سیاسی ریشہ دوانیوں
میں مشغول رہتے ہیں، لیکن ان کی ریشہ دوانیوں کے نقصانات عوام کے سونے
کے ظرف سے دور ہوتے رہتے ہیں، پاکستان کے محافظ پاکستان کے خواص نہیں بلکہ پاکستان کے عوام ہونگے
ان کو اس زمانہ میں بہار کالونی میں ایک معمولی سا مکان مل گیا تھا،

جن میں وہ کسی طرح اپنے بال بچوں کے ساتھ گذر بسر کر رہے تھے، ان کے آس پاس دینہ کے مہاجرین آباد تھے، اس لئے وہ خوش تھے، کہ اپنے پرانے ہموطنوں کے پڑوس میں ہیں، وہ اپنے دفتر میں جاکر اپنے فرائض انجام دیدیتے، پھر دوستوں اور ہموطنوں کی مجلسوں میں بیٹھ کر اپنی رنگا رنگ باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے، وہ اپنے بالائی افسروں کے یہاں جاکر حاشیہ نشینی کرنا مطلق پسند نہیں کرتے، وہ ان کے متعلق گفتگو بھی زیادہ نہ کرتے، ان کے دوستوں کا مجمع نہیں ہوتا تو پھر اپنے گھر آکر کتابوں کے ڈھیر میں گم ہو جاتے، میں ان کے کمرہ میں پہلی بار گیا تو یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ انھوں نے کتابوں کا کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے، ان کا تبادلہ ڈھاکہ سے کراچی یا کراچی سے ڈھاکہ ہوتا تو یہ کتابیں ان کے ساتھ برابر آتی جاتی رہتیں، ان میں انگریزی اور اردو دونوں کتابیں ہوتیں، دار المصنفین کی مطبوعات کو بہت شوق سے پڑھتے تھے، اور یہاں کی اکثر کتابیں خرید لی تھیں، ایک روز میں ان کے کمرہ میں بیٹھا تھا، تو وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے اب ماشاء اللہ تم لکھنے لگے ہو، تمھاری تحریر گنجلک نہیں ہوتی، مطلب کو صاف اور واضح ادا کر لیتے ہو، جو کچھ لکھتے ہو، محنت، تلاش اور جستجو کر کے لکھتے ہو، مگر یہ کیا بات ہے کہ تمھاری کتابوں اور مقالوں میں کوئی تمہید نہیں ہوتی جو کچھ کہنا چاہتے ہو تمہید کے بغیر شروع کر دیتے ہو، یہ کیوں؟ پھر کہنے لگے کہ ذرا طبیعت کو رنگین بناؤ، تو تحریر بھی حسین ہوگی، ملا بنے رہو گے تو تحریر میں رعنائی اور

رنگینی پیدا نہ ہوگی، کسی بھی حسن کو دیکھو تو قوت باصرہ کو ذرا حرکت دیدو، پھر دیکھو
اس کا اثر تمہارے قلم پر پڑتا ہے کہ نہیں، حسن کی تخلیق اسی لئے ہوتی ہے کہ اس سے
خیالات، احساسات، اور جذبات رنگین ہوں، اگر حسن نہ ہو تو تخیل میں نزاکت
اور لطافت نہ پیدا ہو، نزاکت اور لطافت کے لئے حسن ناگزیر ہے، اب تم اپنی
تحریر میں نزاکت اور لطافت چاہتے ہو تو حسن کے ادا شناس بنو، خواہ یہ کائنات
کا حسن ہو یا عندلیب کے نغمہ کا حسن ہو، یا پھولوں کی رعنائی کا حسن ہو، یا سبزہ زاروں
کا حسن ہو، یا رنگین مرغزاروں سے ہو کر بہتے ہوئے چشموں کا حسن ہو، یا خالق کی
مخلوق ہی کا حسن ہو، یا اس کی حسین مخلوق کی اداؤں اور عشووں ہی کا حسن ہو
یا کوئی چھم سے چلے تو اس کی چال ہی کا حسن ہو، میں نے ان کو روک کر کہا تم نے
پھر درس و تدریس شروع کر دی، تم ہر لمحہ میرے استاد بننا چاہتے ہو، میں تمہارے
پاس نہیں ہوتا ہوں تو تمہاری استادی کا جذبہ دبا رہتا ہے، لیکن بہت ہی مؤثر
انداز میں بولے کہ تم ہی ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا، کہنے لگے کہ
میری ایک بات یاد رکھو، اپنی تحریروں میں مولانا شبلی کی لطافت، سید صاحب
کا وزن اور وقار اور اسی کے ساتھ حالی کا اخلاص بھی ضرور پیدا کرو، تب
ہی تمہارے علمی کارناموں میں جان پیدا ہوگی اور تم علمی دنیا میں عزت کی
نظر سے دیکھے جاؤگے، میں نے جواب دیا، اس نصیحت کے ساتھ اس کے
لئے دعائیں بھی کرو،

ایک روز دیسنہ پر گفتگو ہونے لگی تو کہنے لگے کہ دیسنہ والوں کو دولت نہیں ملی، لیکن ان میں بڑی باہمی محبت تھی، ان کو بڑے بڑے عہدے تو حاصل نہیں ہوئے، لیکن ان کے باہمی مہر و وفا سے ان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں بڑی دل آویزی تھی، جو اب پاکستان آنے کے بعد رفتہ رفتہ ختم ہو جائیگی، ایسے کہ ڈاکٹر شمیم کے ساتھ مل کر میں نے ڈھاکہ میں اس اجتماعی زندگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، کراچی میں بھی مصباح الہدیٰ اور ولی کمال بھی وہی فضا پیدا کرنے کی دھن میں ہیں لیکن یہ جب تک چل رہا ہے، چلے گا، ہمارے چھوٹے بچوں کو دیسنہ کا ماحول نہیں ملا، اسلئے ان کو دیسنہ کی روایت سے بیگانگی ہوتی جائے گی، اور اب تو ہم شہری زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے جائیں گے، زنانخانہ، خلوت خانہ اور مردانہ نشست کا تمدن ختم ہو کر اب فلیٹ یا دو تین کمروں کی رہائش کا تمدن غالب آجائیگا، اب اس کا اہتمام باقی نہ رہیگا کہ زنانخانہ کی آواز باہر نہ پہنچنے پائے، اور دس برس کے سن کی لڑکی کی کوئی جھلک نہ دیکھے، اور نہ اس کی کوشش ہوگی کہ چھوٹی بہن اپنے بڑے بھائی کے سامنے اپنے شوہر سے نہ ملے، خسر، ساس اور جیٹھ کے سامنے آنے جانے میں حیا، شرم اور حجاب کا معیار بھی بدل چکا ہوگا، نئی نویلی دلھن بھی اپنے شوہر کے سامنے بدن چرائے ہوئے، لجائے ہوئے اور شرم کھائے ہوئے نہ بیٹھے گی، گھونگھٹ اور نہ منھ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے اور شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا

ہونے کا تمدن گیا، بڑی حسرت کے ساتھ کہنے لگے

کھولو نہ کیوڑ یا اندر آنے دو۔ جی لاڈو،

کا دور بھی ختم ہو گیا، اور یہ نغمہ بھی نہ سنائی دیگا،

اے دمدوا دیکھ ہی لے، لاڈو سہاگ سے بھری، موتی مانگ سے بھری،

پھر یہ کہتے کہ اس تمدن میں کیسی کشش تھی، جس میں شادی میں لڑکی کی رخصتی کے

موقع پر لڑکی کی زبان سے یہ کہا جاتا

کھیلت گڑیا چھوڑوں، چھوڑوں سہیلورن، رکھ ہی لو بہنروا کے لوگ جی

پھر ماں کیسی حیرت سے کہتی،

بیٹی دروازے کھڑا دُلہا کیسے رکھ ہی لیں بہنروا کے لوگ جی

مڑیلا بیٹھا بھیا روے مڑیلا بیٹھے ابا رووین

کیسے رکھ ہی لیں، بہنروا کے لوگ جی

یہ تمدن افسانہ بن کر رہ جائیگا، اب اسکول، کالج، سینما اور پارک

میں جانے والی لڑکیاں اپنا تمدن خود بنائیں گی، دیکھنا یہ ہے کہ یہ تمدن انکو

کہاں لیجاتا ہے، خیر کی طرف یا شر کی جانب

کراچی میں عاشق مرحوم کے ساتھ تقریباً ڈھائی مہینے رہا، اور جب

ان سے رخصت ہو رہا تھا تو کہنے لگے کہ میں تو اب شاید دیسنہ کبھی نہ جاسکوں،

لیکن میری طرف سے اس کی گلیوں کو سلام کہنا، اس کی مسجد کو بھی، اس کے

امام باڑہ کو بھی، اس مدرسہ کی عمارت کو بھی جہاں کمتب کی تعلیم پائی تھی،
اس گاؤں کے شجر و حجر کو بھی اس کی ندی کو بھی، اس کے ہرے بھرے
کھیتوں کو بھی، سینچر چمار کو بھی، بنچو تیلی کو بھی، جیتی پاسبان کو بھی، نور تقی
والی کو بھی، اس کے ہر فرد و بشر کو بھی، اسکے ذرہ ذرہ کو بھی، اور ہاں پٹنہ
جاؤ تو بی، ان کالج کو بھی، پٹنہ کالج کو بھی، اس کے بی اے اور ایم اے بلاک
کو بھی، جہاں زندگی کی مرادوں اور امنگوں کے بہترین دن گذرے، جہاں
پروفیسر ایل آر مرینوگی، تار پورے والا، پروفیسر عبدالمنان، پروفیسر
حسن عسکری کے لیکچرز سن کر بہت کچھ سیکھا، ہاں پٹنہ کے مرادپور بازار کی
سڑکوں کو بھی، بانکی پور لان کو بھی، ان ساتھیوں کو بھی جو تقسیم ہند کے بعد
ہندوستان ہی میں رہ گئے ہیں، ان کے اس سلام میں ترکِ وطن کی بڑی
حسرت بھری تھی،

کراچی سے آنے کے چھ مہینے کے بعد ان کا خط ملا، کہ وہ حکومت
پاکستان کی طرف سے بی بی سی لندن کے ریڈیو سسٹم کا مطالعہ کرنے جا رہے
ہیں، ان کے اس اعزاز کی خبر سے خوشی ہوئی، وہ انگلستان گئے تو انھوں نے
سفر فرنگ کے نام سے اپنا ایک دلچسپ سفر نامہ بھی لکھا،
ان کا ہوائی جہاز بصرہ، دمشق اور زیورک (سوئٹزرلینڈ) ہوتا ہوا
انگلستان پہونچا، جہاں برن کے ہوائی اڈے سے ریل گاڑی پر واٹرلو

ہوتے ہوئے لندن پہونچے، جہاں وہ تقریباً آٹھ مہینے رہے، یہاں ان کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ بی، بی، سی کو ریڈیو ٹیلی ویزن کے لائسنسوں سے دو کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کی سالانہ آمدنی ہوتی ہی، جو اس وقت مشرقی پاکستان کی سالانہ آمدنی سے زیادہ تھی، بی، بی، سی کے ترجمان ریڈیو ٹائمز کی اشاعت کی تعداد ہر ہفتہ اسی لاکھ تھی، اس میں اشتہار دینے والے کو چند سطروں کے لئے ڈیڑھ ہزار پونڈ دینا پڑتا ہے، یہاں سے بیالیس زبانوں میں خبریں نشر ہوتی ہیں، ہوم نیوز اڈیٹر کی تنخواہ تین ہزار سالانہ پونڈ ہے، اور سب سے کم درجہ کے اڈیٹر کی تنخواہ بارہ سو پونڈ ہے،

وہ یہاں کے قیام کے زمانہ میں روائٹر کے دفتر، برٹش میوزیم انڈیا آفس، میڈم ٹوسا، پکیڈلی، ویسٹ منسٹرایبے، ٹاور آف لندن، پارلیمنٹ، میوزیم، چڑیا گھر، آرٹ گیلری، اولمپیا، ویسٹ منسٹر، وہائٹ ہال، ڈاوننگ اسٹریٹ، ہائڈ پارک وغیرہ سب کی سیر کی، آکسفورڈ بھی گئے، شکسپیر کے بڑے فدائی تھے، اسلئے اسٹریٹ فورڈ آن اون بھی گئے، جہاں کا وہ رہنے والا تھا، وہ گھر بھی جاکر دیکھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جس پلنگ پر اس کی پیدائش ہوئی تھی، اس کو بھی دیکھا پھر اس ریسٹوران میں جاکر کھانا بھی کھایا، جہاں وہ کھانا کھایا کرتا تھا،

اس کا نام سواین رسٹوران ہے، اور چار سو برس سے اب تک قائم ہے، اسکی
سالگرہ کے موقع پر ہر سال ممتاز ایکٹر اور ایکٹریسیں یہاں آتی ہیں اور اس کے
ڈرامے اسٹیج کئے جاتے ہیں، عاشق مرحوم نے اُس مکان کو بھی جا کر دیکھا جہاں
اس کی بیوی Anne HaThaway پیدا ہوئی تھی،

حضرت سید صاحب کی کتاب خطبات مدراس کے ترجمے سے عاشق مرحوم
کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت ہو گئی تھی، اس لئے ان کو شوق
ہوا کہ وہ کارلائل کا بھی گھر جا کر دیکھیں، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے بڑی عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"لندن کے مضافات میں ایک جگہ چلسی ہے، یہاں مصور
اور آرٹسٹ رہتے ہیں، اسی علاقہ میں کارلائل کا مکان جا کر دیکھا، وہ
کمرہ بھی دیکھا، جہاں کارلائل نے ہیرو اور ہیرو ورشپ لکھی تھی جس میں
اس نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبروں کے ہیرو
کی حیثیت سے پیش کیا ہے"

وہ پیرس بھی سیر کے لئے گئے، لندن میں وہاں کے لوگوں کی ایمانداری
سے متاثر ہوئے، چنانچہ اپنے سفر فرنگ میں لکھتے ہیں، یہاں کے لوگ عموماً
بہت ایماندار ہیں، سڑکوں پر اخبارات رکھے رہتے ہیں اور ریزگاری بھی،
اگر اخبار فروخت کرنے والا وہاں پر نہ ہو تو اخبار خریدنے والا ایک اخبار لے لیگا

Scanned by CamScanner

اور قیمت رکھ دیگا، اگر ریزگاری یعنی ہو تو لے لیگا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں ایک صاحب ہندوستان سے آئے تھے، ان کے پانچ پونڈ کے پانچ نوٹ ایک سینما ہاؤس میں گر گئے، وہاں دوسرے دن دریافت کیا تو ان کو بتایا گیا کہ جو عورت سینما ہاؤس کی صفائی کی دیکھ بھال کرتی ہے، اس نے یہ پچیس پاؤنڈ پائے تھے، اور سینما ہاؤس کے ٹکٹ فروخت کرنے والے کے حوالے کر دیئے

وہ انگریزوں کی رواداری سے بھی متاثر تھے، اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ لندن میں دنیا کے ہر ملک سے لوگ آکر پناہ لیتے ہیں، یا تو معاش کی فکر میں یہاں آتے ہیں، یا اپنے اپنے ملکوں کے سیاسی نظام سے تنگ آکر یہاں سکون حاصل کرتے ہیں، دولت مشترکہ کے شہری تو برابر یہاں آکر سکونت اختیار کرتے رہتے ہیں، ویسٹ انڈیز تو ہر سال اپنے لوگوں کو یہاں ایکسپورٹ کرتا ہے کالے لوگ اور حبشی تو یہاں کافی نظر آتے ہیں، اسی لئے ایک انگریز نے جل کر لکھا کہ اتنے کالے لوگ یہاں آگئے ہیں کہ اب انگریزوں کی نسل کالی یا بھوری ہو جائیگی، اکمیونزم کے باوا آدم کارل مارکس نے بھی یہاں آکر پناہ لی تھی اور یہیں وفات پائی،

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ہائیڈ پارک میں کھڑے ہوکر انگریزوں کو بے نقط سناتے ہیں، اور انگریز سب کچھ سنتے ہیں، ایک دفعہ ایک حبشی تقریر کر رہا تھا کہ انگریز بد معاش ہیں، میلے ہیں، مجمع سے ایک

Scanned by CamScanner

آواز آتی کہ تب بھی دنیا کے بہترین لوگ ہیں،

وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ انگلستان فلاح و بہبود یعنی ویلفیر سٹیٹ ہے، بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو ماں کو مفت دودھ ملتا ہے، خاص عمر کے چھوٹے بچوں کو بھی دودھ مفت دیا جاتا ہے، ثانوی تعلیم مفت ہوتی ہے، سب بڑی اولاد کے علاوہ ہر اولاد کے لئے ہر ہفتہ دس شلنگ کا وظیفہ ملتا ہے، ۶۵ برس سے اوپر کے مرد اور عورت کو پنشن ملتی ہے، اگر اولاد زیادہ ہے تو اوسط آمدنی والے کا انکم ٹیکس بہت کم ہو جاتا ہے، اگر کوئی کسی ڈاکٹر کے یہاں اپنے کو رجسٹرڈ کرا لیتا ہے، تو ڈاکٹر جو نسخہ لکھتا ہے، اس کو لیکر وہ دوا کی دوکان پر جاتا ہے تو دوکاندار دوا کی قیمت صرف ایک شلنگ لے گا، خواہ اس کی قیمت دو پونڈ ہی کیوں نہ ہو، دوکاندار نسخہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے، اور بقیہ رقم حکومت سے وصول کر لیتا ہے، اس پر کروڑوں روپیے ہر سال گورنمنٹ کا خرچ ہے، یہ رعایت برطانیہ کے باشندوں کے علاوہ غیر ملکیوں کے لئے بھی ہے، جو وہاں مقیم ہیں، اگر کوئی شخص بے روزگار ہو جاتا ہے تو اس کو بے روزگاری کے انشورنس سے خورد و نوش کے لئے وظیفے ملتے رہتے ہیں، اگر بالکل بے روزگار ہو تو اسکو نیشنل بورڈ سے کفالت کے لئے رقم ملتی رہتی ہے، لیکن وہاں عموماً آدمیوں سے زیادہ ملازمتیں ہوتی ہیں، دکانوں پر قسط وار ادائیگی پر ساری چیزیں مل جاتی ہیں، غریب سے غریب آدمی بھی ٹیلی ویژن اور ریڈیو سٹ رکھتا

Scanned by CamScanner

ہے، اور ہفتہ وار چند شلنگ قسط وار ادا کرتا ہے، ایسے ملک میں بھلا کمیونزم کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے،

اقبال کے مطالعہ سے عاشق مرحوم کا دل مرد مومن کا دل بن چکا تھا، اسلئے اپنے سفر نامہ کے اخیر میں لکھتے ہیں:

"سب کچھ دیکھا، مگر فرنگ کی رعنائیاں ہمارے روحانی امراض کا مداوا نہیں ہو سکتیں، روحانی قدریں جو ایشیا میں ہیں، وہ فرنگ میں نہیں، مادیت کا زور ہے، اور اس برق رفتار زندگی میں سکون نہیں، اپنا وطن بہت غنیمت معلوم ہوا، جہاں کچھ تو سکون میسر آجاتا ہے، پھر بھی اللہ کے نام لیوا موجود ہیں، جہاں زندگی نگار خانہ عشرت نہیں، جہاں بندہ اپنے خالق کے سامنے نیاز سے سر خم کرتا ہے، اور اسی سے سب کچھ مانگتا ہے،...... یہ صحیح ہے، کہ اہل فرنگ میں بہت سی دنیاوی خوبیاں ہیں، مگر اخلاقی اور روحانی قدروں سے بڑی حد تک نا آشنائی ہے، ان کا مادی تمدن انھیں کہاں لے جائیگا، اس کا احساس ان کو خود نہیں، لندن اور پیرس میں رعنائیاں بہت ہیں، ہر قدم پر جلووں کی بارش ہے، مگر یہ سب مرہون غازہ ہیں، مادی تمدن معراج کمال کو پہونچ چکا ہے، مگر انسانیت اور مروت سے خالی ہے، ابھی مشرق سے مغرب کو بہت کچھ سیکھنا ہے"

یہ تحریر اس کی ہے جو ایک طرف تو شکسپیر سے متاثر تھا، دوسری طرف

اقبال کا پرستار تھا، لیکن اس نے اپنے عینی مشاہدے کے بعد ردمیو جو لیٹ، ٹو الفتہ نائٹ، اور ہملیٹ کے بجائے زبور عجم، بال جبرئیل، ضرب کلیم، اور جاوید نامہ کے سرمدی نغموں کو اپنے کانوں میں گونجتے ہوئے پایا،

عاشق مرحوم نے اپنا مطبوعہ سفر نامہ، سفر فرنگ میرے پاس ڈھاکہ سے بھیجا تو میں نے اس کو شوق سے پڑھ کر ان کو لکھا کہ اس سفر کی کہانی کا مزہ تو تمہاری زبانی ہی سنکر آئے گا، اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ پھر جلد آکر ملو،

لیکن ان سے ملنے کا اتفاق ان کے اس سفر کے چھ برس کے بعد اکتوبر ۱۹۶۲ء میں ہوا، جب وہ شدید قسم کے اعصابی مرض میں مبتلا تھے، میں اپنے ماموں زاد بھائی محمد وسیم دسنوی اسسٹنٹ انجینیر کی لڑکی رفعت ستّھا کی شادی خانہ آبادی میں شرکت کے لئے ڈھاکہ پہونچا، تو اسٹیشن سے سیدھے ان کے گھر پہونچا، میرے ساتھ اس سفر میں میرے خالہ زاد بھائی سید فضیلت کریم اسپیشل آفیسر، بہار سکریٹریٹ بھی تھے، وہ بھی عاشق مرحوم کو بہت مانتے تھے، ان سے بھی بڑی بے تکلفی تھی، ہملوگوں کو دیکھ کر وہ مسکرائے، پھر ہنسے، لیکن خاموش رہے، میں نے ان کو چھیڑا، جھنجھوڑا، چوما، چاٹا، گدگدایا، مگر وہ ساکت وصامت رہے، بولنے کے لئے اصرار کرتا تو کہتے جی نہیں چاہتا، ان کے والد، چھوٹے بھائی، بیوی، بچے سب

اعزہ سب ان کی اس کیفیت سے پریشان تھے، لیکن وہ اپنے بستر پر پڑے رہتے، کسی سے کوئی مطلب نہیں رکھتے، ان کی ظاہری صورت مریض کی نہ تھی، صحت بھی بظاہر اچھی تھی، چہرہ پہ مرض کی کوئی علامت نہ تھی، ان کے سر کے بال تو ابھی بالکل سیاہ تھے، میں ان سے کچھ ہی بڑا تھا، لیکن میرے سارے بال سفید ہو چکے تھے، ان کو کوئی خانگی اور مالی پریشانی بھی نہ تھی، ان کی بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی، اب وہ نانا بھی بن چکے تھے، ان کے داماد عزیزی شوکت امام ام، بی، بی، اس ہو کر وہیں پریکٹس کر رہے تھے، اور چل نکلے تھے، ان کے بڑے لڑکے عزیزی احسان الحق حکومت کے وظیفہ پر انگلستان اف، آر، سی، ایس کی ڈگری لینے گئے ہوئے تھے اور بچے مصباح الحق وغیرہ بھی اچھی تعلیم پا رہے تھے، پھر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ تقریباً ڈیڑھ سال سے بستر پر پڑے رہتے، میں اپنی عزیزہ کی شادی کی مجلسیں چھوڑ چھوڑ کر ان کے پاس پہونچتا، لیکن وہ کسی طرح اپنی خاموشی نہیں توڑتے، اپنی ایک تازہ تصنیف "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے" ان کو لیجا کر دی تو شوق سے ہاتھ میں لیا، ادھر ادھر پڑھنے کے بعد صرف اتنا کہا، اچھی کتاب ہے، پھر کچھ نہ بولے، ان کے خاص عزیز اور میرے عزیزوں سے بھی بڑھ کر عزیز برادرم مقتدی کریم انکم ٹیکس افسر، اپنی باتوں میں بلبل کی طرح چہکتے رہتے ہیں، ان کے پاس برابر بیٹھے رہتے، ان کو لطیفے اور چٹکلے سناتے، زبردستی اپنی موٹر پر بٹھا کر ہم لوگوں کے ساتھ ڈھاکہ کی سیر کرانے لے جاتے، لیکن ان کی خاموشی

Scanned by CamScanner

نہیں جاتی، کئی بار میں ڈاکٹر محمد شمیم کو ساتھ لیکر ان کے پاس پہونچا، کمرہ بند کیا، کسی کے کرے سے کرے بجاتی چلی کے قصے سنائے، پھر کسی رنگیلی، چمکیلی، کسی خام روپ کسی چت لگن اور کسی کام روپ کی باتیں سنائیں، جو انی کی راتیں اور مرادوں کے دن یاد دلائے، لندن کی لیلاؤں، بدر منیروں، اور زلیخاؤں کے حال پوچھے مگر وہ بلبل خوش نوا بلبل بیمار ہی بنا رہا،

اس سفر میں میری اہلیہ کے ساتھ میرے بچے بھی تھے، عاشق مرحوم مجھ سے چھوٹے تھے، لیکن ان کی شادی میری پہلی شادی سے چھ سال پہلے ہوئی، میری پہلی اہلیہ رابعہ خاتون مرحومہ شادی کے آٹھ سال بعد اپنی یادوں کا محل بنا کر داغ مفارقت دے گئیں، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، میری دوسری شادی عاشق مرحوم کی شادی کے بیس سال بعد ہوئی، جس سے دو لڑکیاں عشرت افروز اور مسرت افروز، دو لڑکے احتشام الرحمٰن اور شاکر الرحمٰن ہیں، عاشق مرحوم نے ان کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، تو میں ان کو ان کے پاس لے گیا، ان کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے یہ تمہاری تصانیف بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، بزم مملوکیہ اور ہندوستان کے عہد کا فوجی نظام کے ڈی لکس اڈیشن ہیں، یہ سن کر میں خوش ہوا کہ وہ اپنے رنگ پر شاید آگئے، میں نے ان سے کہا تم پڑھنے لکھنے میں خرگوش تھے، اور میں کچھوا، اسی طرح اپنی ازدواجی زندگی میں بھی کچھوا رہا، اور تم خرگوش، تم نانا ابا ہو گئے، تو میں صرف ابا ہوں، بولے

دیر آید درست آید، پھر کہنے لگے کہ تمہاری اہلیہ تو ابھی جوان ہیں، تمہارے سامنے غزل بن کر آتی ہونگی، میری بیوی اپنے سن کے سحاظ سے رموز بیخودی کی مثنوی بن چکی ہیں، میں اور بھی خوش ہوا کہ اب وہ اصلی ...... رنگ پر ضرور آجائیں گے لیکن پھر کچھ اور نہ بولے،

ڈھاکہ کا میرا یہ سفر دوسرا تھا، پہلی بار سے زیادہ اس کو ترقی یافتہ پایا، اب اس کی بعض سڑکوں پر کلکتہ کی چہل پہل نظر آنے لگی تھی، جناح ایونیو، اسٹیڈیم اور مسجد بیت المکرم سے بڑی رونق آگئی تھی، دھان منڈی، گلشن، نیو اسکاٹن، ایوب ایونیو، محمد پور اور موتی جھیل وغیرہ میں بڑے بڑے مکانات بن گئے تھے، مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں کی عمارتیں بھی تعمیر ہوگئی تھیں، سڑکوں پر کافی بھیڑ بھاڑ رہنے لگی تھی، البتہ بس سروس خاطر خواہ نہیں ہوسکی تھی، گو موٹروں اور اسکوٹروں کی بڑی فراوانی تھی، مختلف جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا، عزیزوں اور دوستوں نے اچھی اچھی دعوتیں کیں، لیکن اس مرتبہ کہیں عاشق مرحوم کا ساتھ نہیں رہا، ہر جگہ سو تکلف رہے، لیکن ان کی سیدھی بات نہیں ملی، مجلس شبستان میں شمع ضرور جلتی رہی، لیکن بزم جس سے روشن ہوتی وہ نہ تھا، جب ڈھاکہ سے رخصت ہوا تو دل کہہ رہا تھا، تھیں تو ڈھاکہ میں اس کی باتیں تھیں، رے چلیں اب وطن کو کیا سوغات،

ڈھاکہ سے آنے کے کچھ دنوں کے بعد ہی برادرم شمیم کے خط سے معلوم

ہوا کہ عاشق مرحوم کی طبیعت بحال ہو گئی، اور وہ اپنے پرانے رنگ پر آگئے ہیں، اور پھر رونق مجلس ہو رہے ہیں، یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے خود مجھ کو خط لکھا کہ وہ اب تبدیل ہو کر کراچی جا رہے ہیں، وہاں پہونچ کر ان کی ترقی بھی ہو گئی، اور وہ مونی ٹرنگ سروسز کے ڈائرکٹر ہو گئے ہیں، ان خبروں سے مسرت ہوئی، ان ہی دنوں میرا ایک تنقیدی مقالہ معارف میں "ہندوستان کی سولہویں اور سترھویں صدی میں مسلمانوں کی مجددانہ تحریکیں" کے عنوان سے مختلف قسطوں میں شائع ہوا تھا، عاشق مرحوم نے مجھکو لکھا کہ یہ مضمون پاکستان کے علمی حلقہ میں بہت پسند کیا جا رہا ہے، اس لئے وہ اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں،

مگر میں اگست ۱۹۶۷ء میں سخت علیل ہو گیا، میرا ایک آپریشن اعظم گڈھ کے اسپتال میں ہوا، دوسرے بڑے آپریشن کے لئے پٹنہ گیا، جہاں اپنے پرانے شفیق معالج ڈاکٹر عبد الحئی (سابق پروفیسر میڈیسن پٹنہ میڈیکل کالج) کے مشورے سے وہاں کے مشہور سرجن ڈاکٹر یو۔ ان۔ شاہی (پروفیسر سرجری پٹنہ میڈیکل کالج) کے کلی نک میں داخل ہوا، عاشق مرحوم کو کلی نک کا پتہ معلوم نہ ہو سکا، اس لئے برادرم محمد شمیم سے میری خیریت پوچھتے اور اپنے تردد کا اظہار کرتے رہے، میں اس کلی نک میں دو مہینے مقیم رہا، پہلے تو ایک بڑا سیلاب آیا، جس سے کلی نک پندرہ روز تک پانی میں گھرا رہا، جب یہ سیلاب جا رہا تھا تو ایک روز

Scanned by CamScanner

میں دن بھر فاقہ کر کے ساڑھے تین بجے سہ پہر کو آپریشن کی میز پر لیٹنے ہی کو تھا کہ بہار کے چیف منسٹر کے حکم سے ڈاکٹر، یو ان، شاہی مجھکو اسی حال میں چھوڑ کر ہندوستان کے مشہور سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کو دیکھنے کے لئے دہلی چلے گئے، جو ان دنوں سخت بیمار تھے، ان ہی وجوہ سے میرے آپریشن میں بڑی تاخیر ہو گئی، اس اثنار میں میرے بزرگ محترم جناب ڈاکٹر محمد امام صاحب ریٹائرڈ سول سرجن اور عاشق مرحوم کی بیوی کے منجھلے بھائی میری عیادت کو کلینک میں برابر آتے رہے، وہ مجھ سے بڑی شفقت کرتے ہیں، میرے دل میں بھی انکی بڑی محبت اور عزت ہے، میں نے ان سے زیادہ کسی مرد کو حسین وجمیل نہیں پایا، جوانی میں اگر ان کے چہرے کے سامنے گلاب کے پھولوں کا کوئی گلدستہ رکھ دیتا تو پھر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ گلاب کے پھول زیادہ دل آویز ہیں، یا ان کے رخسار، میں ان کے شباب کو دیکھتا تو دل میں کہتا کہ حضرت یوسف ایسے ہی رہے ہونگے، اور پھر یہ سوچے بغیر بھی نہ رہتا، کہ اس حسن کے لئے تو بہت سی زلیخائیں چاہئیں، اب وہ ستر کے لگ بھگ ہیں، پھر بھی ان کے جمال شگفتہ سے ان کے حسن رفتہ کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے، انکی گفتگو میں بھی بڑا حسن اور بانکپن ہوتا ہے، مجلس کو اپنے فقروں کے سیمیں جھنکاروں سے پُر کیف بناتے رہتے ہیں، وہ کلینک میں مجھکو دیکھنے آتے اور میرے بستر علالت کے پاس بیٹھ جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ اپنے ساتھ دم عیسیٰ

Scanned by CamScanner

اور ید بیضا بھی ساتھ لائے ہیں، ایک روز ان ہی سے معلوم ہوا کہ عاشق مرحوم کو کراچی میں قلب کا سخت دورہ پڑا، اور وہ نبوی اسپتال میں داخل ہیں، یہ سن کر بڑا تردد ہوا، لیکن برادرم شمیم نے خبر دی کہ اب وہ رو بصحت ہیں، ستمبر ۱۹۶۷ء میں ان کی پنشن ہوگئی اور وہ کراچی سے ڈھاکہ چلے آئے، میں بھی نومبر ۱۹۶۷ء میں آپریشن کے بعد بفضلہ تعالیٰ شفا پاکر اعظم گڈھ چلا آیا،

۱۲ مارچ ۱۹۶۸ء کے ایک خط میں میرے خالہ زاد بھائی جناب محمد نسیم صاحب نے ڈھاکہ سے اطلاع دی کہ برادرم عاشق اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ سینما دیکھنے گئے، وہاں سے گیارہ بجے رات کو واپس آئے، تو ان پر قلب کا دورہ پڑا، چوبیس گھنٹے سے بیہوش ہیں، دوسرے دن عم محترم جناب صلاح الدین صاحب کا خط ملا کہ وہ عاشق (مرحوم)، کو دیکھنے ان کے گھر گئے تو دیکھ نہ سکے، بیہوش پڑے ہیں، ڈاکٹروں کی ممانعت ہے کہ کوئی ان کو نہ جگائے، برادر محترم جناب محمد نسیم صاحب کا پھر ایک خط مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۶۸ء کو ملا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، اور بڑے دکھ درد سے یہ بھی لکھا کہ ڈھاکہ کے تمام مشہور ڈاکٹروں کو بچانے میں لگ گئے، لیکن مشیتِ ایزدی یہی تھی کہ وہ جنت میں جاکر آرام کریں، ان کے جنازے میں بہت سے لوگ شریک تھے،

میں ان خبروں کو سننے کے لئے تیار نہ تھا، اور ابھی رنج و غم کے عالم

میں کسی کو کوئی خط بھی لکھنے نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر محمد امام کا ایک تعزیتی خط میرے پاس آیا، میں ان کو صبر جمیل کے لئے کیا لکھتا کہ وہی مجھکو مصلحت خداوندی اور رضائے الٰہی کی تلقین کر رہے تھے برادرم محمد شمیم ان دنوں حج کے لئے گئے ہوئے تھے، جدہ میں اس سانحہ کی خبر ملی تو مجھ کو وہیں سے ۳۰ مارچ ۱۹۶۸ء کو ایک خط لکھا کہ:-

"حادثہ جانکاہ کی خبر تم کو ہو گئی ہو گی، مجھ کو بہت دیر میں خبر ملی، آہ! ہملوگوں کا بچپن کا ساتھی عاشق ہملوگوں سے بچھڑ گیا، یقین نہیں آتا، یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، ہوائی اڈے پر جب ہم لوگ گلے ملے تھے تو ہم دونوں خوش تھے، عموماً لوگ جو حج یا کسی لمبے سفر پر جاتے ہیں، تو روتے ہیں لیکن ہم دونوں ذرا بھی نہ روئے، وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ روضۂ اقدس پر میرا بھی سلام بھی پہونچا دینا، آخر میں کہا بسلامت روی و باز آئی، ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ آخری ملاقات ہے، سوچتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، وہ ماشاء اللہ پچھلی بیماری سے بالکل اچھے ہو چکے تھے، لیکن احتیاط جاری تھی، زینوں پر سے اوپر نہیں چڑھتے، سگریٹ پینا بھی کم کر دیا تھا، غذا میں بھی بڑی احتیاط کرنے لگے تھے لیکن معلوم نہیں کیا ہوا، غالباً ۱۰ بقرعید (۱۱ مارچ ۱۹۶۸ء) کو طبیعت

خراب ہوئی اور ۱۳ار بقرعید (۱۳ ارمارچ ۱۹۶۸ء) کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، تم سامنے ہوتے تو میں تم سے گلے مل کر خوب روتا، حج کی خوشی جاتی رہی عاشق ہم لوگوں سے ہر چیز میں آگے رہے، لکھنے پڑھنے شادی ملازمت، اور اولاد اور اولاد کی شادی میں، اس معاملہ میں بھی وہ ہم لوگوں سے سبقت لے گئے، دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں، آمین ثم آمین، سوگوار شمیم"

میرے دوست اور ہموطن پروفیسر مصطفیٰ کریم ندوی نے دربھنگہ سے مجھکو لکھا کہ تمھارا مکتب کا ساتھی اور لنگوٹیا یار جنت کو سدھارا، میرے ماموں جناب عبدالقیوم صاحب نے کراچی سے ان کی موت کی خبر دی، اور وہاں کے جنگ اخبار میں ان پر جو تعزیتی مضمون شائع ہوا، اس کا تراشہ میرے پاس بھیجا، بزرگوں، عزیزوں اور ہموطنوں نے جو خطوط لکھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو خیال تھا کہ میرے لئے یہ حادثہ بہت ہی جانکاہ ثابت ہوگا،

ان کا یہ خیال صحیح تھا، یہ تحریر لکھ رہا ہوں اور دل یہ کہہ رہا ہے کہ کاش میں تمیم بن نویرہ بن جاتا، جب اس کے بھائی کی موت ہوئی تو اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ شہر شہر مارا پھرتا تھا، جہاں پہونچ جاتا عورت و مرد اس کے آس پاس جمع ہو جاتے، وہ بھائی کا مرثیہ پڑھتا، خود روتا، اور لوگوں کو

رلاتا، یا کاش میں غالب کی طرح شاعر ہوتا تو میں بھی لکھتا کہ اے فلک تیرا کیا بگڑتا جو وہ نہ مرتے کوئی دن اور، حالی نے اپنے استاد غالب کی وفات کے بعد بزم سلطانی، تخت خاقانی، راح ریحانی، عقل ربانی اور حسن کنعانی کو فانی پاکر بجز ہستی کو محض سراب اور طلسم خواب و خیال پایا تھا، عاشق مرحوم کو یار غمگسار کے ساتھ اپنا استاد بھی مانتا رہا، ان کے بعد مجھکو بھی اس دنیا کی دلربائی خندۂ گل سے بے بقاتر اور جنس کاسد سے ناروا تر نظر آنے لگی ہے، آہ! پیارے عاشق! تیرا جنازہ میں نے اٹھتے نہیں دیکھا، اور میں شاید مجھکو لحد کی آغوش میں جاتے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ علم کا کمال، گفتگو کا جمال، زبان کی شیرینی، رنگین بیانی کی دلآویزی انسانی محبت کی رعنائی کبھی سپرد خاک نہیں ہوتی، اقبال کہہ گئے ہیں کہ مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں، ان کا یہ بھی پیام ہے کہ یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں، پیارے عاشق! تو جدا ہو نہیں ہو سکتا ہے، ہاں تو اس وقت کوثر و تسنیم کے کنارے کھڑا ہوگا، حوریں تیری بذلہ سنجیوں سے ضرور محظوظ ہو رہی ہونگی، تو ساکنان جنت کی مجلس کو اسی طرح رونق بخش رہا ہوگا، جس طرح اپنے دوستوں کی مجلسوں کو بخشتا رہا، ہاں زہد تیرا شعار نہ تھا، لیکن تیری بے ریائی خاکساروں سے خاکساری، اعزہ سے ہمدردی، دوستوں کی دلجوئی، تجھ کو آغوش رحمت خداوندی میں ضرور لے جائیگی، ہاں تو اپنی بیوی، بچوں،

عزیزوں اور دوستوں کو سوگوار ضرور چھوڑ گیا، لیکن اس سوگواری کی ظلمات میں تیری یادوں کی روشن جبین اسی طرح چمکتی رہے گی جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے ہیں، جا خداوند قدوس کی ستاری، غفاری کے سائے میں جا، تو انسان تھا، دنیاوی آلائشوں سے ضرور ملوث ہوا، لیکن تیری خوبیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی کریمی اور رحیمی سے تجھ کو اپنی پناہ میں لے گا،

الوداع اے پیکر محبت! رخصت اے جان اخلاص! تیری تربت پر رحمت خداوندی اور برکت ایزدی کی بارش ہوتی رہے، تیری روح جنت نعیم کی خوشبوؤں میں معطر رہے، تو نے سب کو بھلا دیا دل سے مجھکو دل سے بھلائے کون، اور ہم سب یہ کہہ کر ہمیشہ اشکبار رہیں گے،

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں